امتیازِ حق

راجا غلام محمد

فضل حق خیرآبادی اور اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ

مطبوعہ: مکتبہ قادریہ، لاہور

فضل حق خیر آبادی اور اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ

امتیازِ حق

مع ضمیمہ

امتیاز حق اربابِ تحقیق کی نظر میں

راجا غلام محمّد
صدر ادارۂ ابطالِ باطل لاہور

مکتبۂ قادریّہ ○ لاہور

نام کتاب : امتیازِ حق

تالیف : راجا غلام محمد، صدر ادارۂ ابطالِ لاہور

کتابت : محمد عاشق حسین ہاشمی، چنیوٹ

سن طباعت : صفر المظفر ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء

طابع : ایم منیر قاضی

مطبع : ملی پرنٹرز - ۹ سرکلر روڈ - لاہور

قیمت :

ملنے کے پتے :

(۱) مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ، لوہاری منڈی لاہور

(۲) مکتبہ شمسیہ، شمس العلوم جامعہ رضویہ۔ ایس ٹی ۴/۲ بلاک نارتھ ناظم آباد کراچی

۳- مکتبہ غوثیہ ہدایت القرآن، ممتاز آباد، ملتان

۴- مکتبہ اشرفیہ، مریدکے

فہرست

امتیازِ حق اربابِ تحقیق کی نظر میں

از مولانا مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی مدظلہ العالی

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقسیمِ ہند تک مسلمانانِ ہند کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ فرقۂ وہابیہ انگریز کا کاشت کردہ پودا ہے جس کی آبیاری اس نے نہایت ہوشیاری سے کی اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ یہ نظریہ کسی بدگمانی پر مبنی نہیں تھا، بلکہ اس کی بنیاد وہ حقائق ہیں جن کو خود وہابی حضرات نے بیان کیا۔ انہوں نے انگریز حکومت کو درخواست دے کر اپنے لیے "وہابی" کی بجائے "اہل حدیث" کا نام منظور کرایا۔ (مقدمہ حیات سید احمد از پروفیسر محمد ایوب قادری، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ص ۲۶)

ہندوستان میں وہابیت کی بنیاد سید احمد بریلوی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کے ذریعے رکھی گئی جن کو انگریز نے اپنی نگرانی میں تحریکِ جہاد کے نام پر منظم کیا اور پھر ان کو بڑی حفاظت سے پٹھانوں کے علاقہ (سرحد) میں پہنچایا اور دوہرا فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف اس نے وہابی تحریک کے ذریعے صوبہ سرحد میں جہاد کے نام پر اپنے دونوں دشمنوں سکھوں اور پٹھانوں کو الجھایا، تو دوسری طرف مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے فتنہ برپا کر دیا۔ قیامِ پاکستان تک اس تاریخی حقیقت کا کسی نے انکار نہیں کیا، بلکہ اس وقت کے سو سالہ دور کے تمام ریکارڈ، سوانح اور تواریخ اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ قیامِ پاکستان کے نئے موڑ کو غنیمت سمجھتے ہوئے انہوں نے تاریخ کو مسخ کرنا مناسب سمجھا اور سید احمد اور اسمٰعیل دہلوی کی تحریکِ وہابیت کو تحریکِ آزادی اور ان کی انگریز دوستی کو انگریز دشمنی کا نام دینا شروع کر دیا۔ اس بددیانتی کے سرخیل غلام رسول مہر ثابت ہوئے، جنہوں نے اپنی تصنیفات میں مسلمہ تاریخی واقعات کو اپنے ذاتی نظریہ کے تحت بدل کر خیانت کی اور یہ اعلان کیا "ہمیں مجاہدین کی شان و آبرو کو بہرحال

قائم رکھنے کا قائل ہوں۔ اگرچہ وہ سابقہ بیانات کے عین مطابق نہ ہو۔(افادات مہر، ص ۲۲۱)

اسی بنا پر انہوں نے ان وہابی قائدین کے بیانات کو بھی نظر انداز کر دیا جو اس تحریک میں شامل یا قریب سے دیکھنے اور سننے والے تھے، اسی طرح انہوں نے محل و قوع اور واقعات پر مشتمل سو سال قبل لکھی ہوئی تواریخ کا ذکر تک نہ کیا، بلکہ ان سے لاعلمی کا اظہار کر دیا، چنانچہ شیر محمد بتی صاحب جو ابھی بقید حیات ہیں، انہوں نے مہر صاحب سے "تاریخ تناولیاں" "تواریخ ہزارہ" کے متعلق استفسار کیا، تو جواب میں اول الذکر کے متعلق کہا امید نہیں کہ ہاتھ آئے اور "تاریخ ہزارہ" کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ حالانکہ ان دونوں کتب کے علاوہ "تاریخ پشاور" بھی پاکستان کی معروف لائبریریوں بلکہ لاہور کی لائبریریوں میں بھی موجود ہیں، اگرچہ حالیہ سالوں میں ان کو غائب کر دیا گیا ہے، اب بھی ناپید نہیں ہیں۔ مہر صاحب جس واقعہ کی تاریخ لکھ رہے ہیں، اس سے متعلق قدیم کتب تاریخ سے لاعلمی ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مہر صاحب قوم کو قصداً اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں، ورنہ مورخ ہونے کی حیثیت سے مہر صاحب واقعہ کے متعلق تاریخی کتب سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ درحقیقت مذکورہ کتب سید صاحب کی تحریک کا اصل رُخ واضح کرتی ہیں تواریخ ہزارہ کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"وہ خلیفہ سید احمد پر شک کرتے تھے کہ یہ شاید انگریزوں کے مشورے سے واسطے فتح اس ملک کے آیا ہے جہاد کا نام فرضی مقرر کیا ہوا ہے" (ص ۲۵۰) "یہ خلیفہ سید احمد لاہور وغیرہ (سکھوں) کی طرف نہیں جاتا۔ یہ صرف اس کی باتیں ہیں، اصل غرض اس کی ہمارے ملک کو پامال کرنا ہے" (ص ۲۴۰)

"یہ سوات میں چلے گئے، وہاں بھی ان کے عقائد خلاف شرع نے یہ اثر دکھلایا کہ اخون صاحب (موجودہ والئی سوات کے دادا) نے ان کے کفر کا حکم دیا اور ان کو نکلوایا" (ص ۲۴۷)

"انبیاء اور اولیاء وغیرہ بزرگوں کے ذکر میں گستاخانہ کلام ہمیشہ ان سے ہوتا ہے جو خلاف شان اس عظیم الشان گروہ کے ہے" (ص ۲۴۷)

جناب راجا غلام محمد نے زیر نظر کتاب میں سید احمد اور اسمٰعیل دہلوی کے اصل کردار کو واضح فرماتے ہوئے اس دور کے مسلم قائد تحریک آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی کے کارناموں کا تعارف بھی کرایا ہے۔ قوم راجا صاحب کی اس کوشش کی ممنون ہوگی۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

برِصغیر ہندوستان میں تجارت کے نام سے داخل ہونے والے غیر ملکی مختلف حیلوں سے ملک پر قابض ہو گئے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنت پارہ پارہ ہوتی گئی۔ سلطان ٹیپو شہید اور سراج الدولہ نے آندھیوں میں چراغ جلائے، مگر اندھیرے چھٹ نہ سکے ؎

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

مسلمان کسی حکومت کا سربراہ ہو تو اس ملک کا مالک و مختار نہیں ہوتا، وہ خدا کی نیابت کے فرائض انجام دیتا ہے اور اس نیابت کی حد تک مسلمان کے لیے حکمرانی لابدی ہے۔ اسلام میں محکومی کا تصور تک نہیں ہے۔ اپنی کمزوریوں اور حالات کی ستم ظریفی کے باعث حکومت ہم سے چھن گئی، مگر ہمارا خمیر آزادی سے اٹھا ہے۔ غلامی اور محکومی ہمارے لیے قابل برداشت نہیں ہوتی۔ انگریزوں نے مختلف حربوں سے ہمیں کاروبارِ حکومت سے بے دخل کیا تھا۔ اس نے مختلف حیلے استعمال کیے کہ ہم اپنی آزادی کی بات نہ کریں اور اس کی غلامی کے جوئے کو گلے کا ہار بنائے رکھیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے شہرہ آفاق فارمولے کو بھی استعمال کیا:

"لڑاؤ اور حکومت کرو۔"

اس نے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا کیے جنہوں نے کلمہ گوؤں کے خلاف کفر اور شرک

کے فتوے دیئے۔ اہلِ اسلام کے وہ اعتقادات جن پر صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بزرگانِ دین کے اقوال وارشادات اور اعمال وافعال کی بنیاد رہی ہے۔ ان کو خلافِ توحید ٹھہرایا گیا۔ محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی بیخ کنی کرنے اور سرکار کے ناموس کی حرمت وعزت کے تحفظ کے احساس کو ختم کرنے کے لیے کوشش کی گئی تاکہ وہ احساس ہی نہ رہے جس پر مسلمان نظامِ کفر کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پاتے ہیں۔

مرہٹوں اور سلطان ٹیپو کی طاقت کو ختم کرنے کے بعد پنجاب کے سکھوں کے علاوہ صوبہ سرحد کے غیور مسلمان ہی انگریزوں کے پورے ہندوستان پر قبضے کی راہ میں کاوٹ سہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی سرپرستی میں مسلمانوں میں سے ایک جماعت تیار کی جو سکھوں سے بھی لڑے اور سرحد کے مسلمانوں سے بھی۔ سرحد کے اہلِ اسلام اپنے معتقدات میں بہت سخت رہے ہیں، انہیں محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثناء کی ذات سے محبت وعقیدت تھی۔ اولیائے کرام، پیروں اور بزرگوں کی وہ ہمیشہ سے عزت وتکریم کرتے آئے ہیں۔ ایسے میں انگریز کی تیار کردہ جماعت اگرچہ حضرت رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بھی پیر ومرشد نہیں مانتی تھی کہ انہیں (نعوذ باللہ) "مر کر مٹی میں مل جانے والا" کہتی تھی، مگر سرحد میں اپنے سربراہ کو پیر کے روپ میں لے کر داخل ہوئے، اس سے کچھ پٹھانوں نے اپنی روایتی عقیدت وارادت سے کام لیتے ہوئے ان کی بیعت کی، لیکن ان کے ارشادات سے آگاہ ہونے کے بعد ان کے مخالف ہو گئے۔

اس تحریک سے انگریزوں نے مطلوبہ مقاصد حاصل کر لیے۔ مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے اور ان کی آپس میں چپقلش سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا، سکھ کمزور ہو گئے اور ان کی کمزوری سے انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ یہ واقعات انیسویں صدی کے دوسرے ربع کے آغاز میں رونما ہوئے تیسرے ربع میں مسلمانوں نے غیر مسلم اور غیر ملکی اقتدار سے جان چھڑانے کے لیے بغاوت کی۔ تحریکِ آزادی کی چنگاریاں سلگتی سلگتی شعلہ بن گئیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اگرچہ ہندو بھی شریک تھے، مگر مسلمانوں نے جان ومال اور آبرو کی پرواہ نہ

کرتے ہوئے انگریزوں کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے جو قربانیاں دیں، ان کی مثال نہیں ملتی، اگرچہ وہ اس میں فوری طور پر کامیاب نہ ہو سکے، مگر ۱۹۴۷ء اسی خواب کی تعبیر کی واضح اور خوش آئند شکل تھی، جب ہم نے آزادی کی سانس لی۔

زندہ قومیں اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کرتیں، اپنی جدوجہد کی تاریخ کو آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں راسخ کرتی ہیں، اپنی کمزوریوں سے سبق سیکھتی ہیں اور اپنے اسلاف کے عزم و استقلال کے مظاہروں کو اپنے لیے راہِ عمل قرار دیتی ہیں۔ انگریز ہمارا دشمن تھا، اس نے ہماری جغرافیائی حیثیت میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی اور بزعم خود ہمارا "مالک و مختار" بن بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے وہ ہماری تاریخ کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو محفوظ کریں، اس کے روشن اوراق کو مشعلِ راہ بنائیں اور اگر کہیں ہم سے کوتاہی ہوئی ہے، تو آئندہ کے لیے اس سے احتراز کرنے کی روش اپنائیں۔ ہمیں چاہیئے کہ جن لوگوں نے جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء میں یا دوسرے موقعوں پر اسلامی تشخص اور آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دیں۔ انگریزی اقتدار کے خلاف علم جدوجہد بلند کیا۔ ان کی یاد کو حرزِ جاں بنائیں، لیکن اگر ہم میں سے کچھ لوگ اس زعم میں ہیں کہ ان کے ہاتھ میں قلم ہے، وہ جو چاہیں لکھ سکتے ہیں، ان کے پاس ذرائع ابلاغ ہیں، وہ جو چاہیں چھاپ سکتے ہیں، انہیں وسائل میسر ہیں، وہ ان کے بل پر "تاریخ" بنا سکتے ہیں تو یہ بات کسی طرح ہماری زندگی کے لیے سمِ قاتل سے کم نہیں ہے۔ جو قوم اپنے ہیروؤں کو بھول جائے یا قوم و ملک کے نئے "محسن" وضع کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی حیات و بقا کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔

انگریز نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے آزمودہ حربے کو استعمال میں لاتے ہوئے مسلمانوں کے مسلمہ معتقدات کے خلاف "تقویۃ الایمان" لکھوائی، اس مقصد کے لیئے "توحید" کے نام پر رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کو کمزور کیا گیا۔ دوسرے بہت سے لوگوں کے علاوہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کی ان کوششوں کا مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے جواب دیا، مسلمانوں کے دو طبقے بن گئے، ایک نے اسلام

کے اجتماعی مفاد میں کام کیا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور دوسرے طبقے نے لوگوں کو دین کی اصل سے ہٹانا چاہا۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کو کم کرکے اسلام کے لیے قربانیاں دینے کا جذبہ ختم کردینے کی سازش کی۔ سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی کے ساتھی وہابی کہلاتے اور آج تک اُن کے متبعین اجتماعی قومی مفادات کے مقابلے میں ڈٹے ہوتے ہیں۔ جب انگریز نے ہم سے حکومت چھین لی تھی، ہماری آزادی سلب ہوگئی تھی۔ جب وقت کی اہم ترین ضرورت انگریزوں سے جنگ کرکے اپنی متاعِ گم گشتہ کی بازیابی تھی۔ سید احمد اور اسمٰعیل دہلوی صاحبان نے انگریزوں کے ایماء پر سکھوں اور ایسے مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑی، جو ان کے معتقدات کو خلافِ اسلام سمجھتے تھے اور اپنے تشخص کو کسی غیر کی غلامی میں ختم کردینے کے خلاف تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جب قوم جنگِ آزادی لڑ رہی تھی "تحریکِ مجاہدین" کے باقیات منقار زیرِ پر رہے یا انگریزوں کی خوشامد میں لگے رہے اور ان کی دی ہوئی سندیں اپنے سینوں پر سجا کر افتخار و ابتہاج کی محفلیں منعقد کرتے رہے۔ جب جنگِ آزادی کے اثرات مابعد کے طور پر علماءِ حق جان و مال اور آبرو کی قربانیاں دے رہے تھے۔ "وہابی" اپنی کتابوں کو انگریز گورنروں کے نام معنون کر رہے تھے اور قرآن و حدیث اور "توحید" کا نام لے کر انگریزوں کے خلاف کیے جانے والے جہاد کی مخالفت میں کتابیں لکھ رہے تھے۔

پھر قلم ان "مجاہدین" کے متبعین کے ہاتھ میں آگیا تو انہوں نے تاریخ تصنیف کرنا شروع کردی، جنگِ آزادی کے مجاہدین اور شہداء کے خلاف کہانیاں گھڑیں اور انگریز کے جاسوسوں کو ان کا دشمن اور جنگِ آزادی کا ہیرو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اس مقصد کے لیے تاریخی ماخذ کی انہوں نے تغلیط کی یا ان سے صرفِ نظر کرنا چاہا اور من گھڑت کہانیوں کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی۔

خدا کی شان کہ آزر خلیل کہلائیں
دلوں میں اپنے بساتے ہیں صنم خانے

زیرِ نظر مضمون میں ان دو دینی حریفوں کے سیاسی کردار کا جائزہ لیا گیا ہے جنہوں نے امتناع النظیر اور دیگر مسائل میں ایک دوسرے کے خلاف لکھا۔ اسماعیل دہلوی نے ایک

ایسے دین کی ترویج کی جو اسلاف کے عقائد کے خلاف اور قرآن و سنت کے واضح احکام سے متصادم معتقدات پر مبنی تھا۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے قرآن و سنت کی رو سے ان کو خلافِ اسلام ثابت کیا اور ان کفریہ عبارات کی تغلیط کی۔ پاکستان کے مشہور نقاد محمد حسن عسکری، اسماعیل صاحب کی کتاب اور اس کی تردید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یوں تو حالی کے زمانے سے بہت پہلے تقویۃ الایمان شائع ہو چکی تھی اور اس بات پر پورا غدر برپا ہو چکا تھا کہ رسول کی عزت صرف اتنی کرنی چاہیے جتنی بڑے بھائی کی۔"

(ستارہ یا بادبان، ص ۳۰۳ - از محمد حسن عسکری)

اسمٰعیل دہلوی کے پیروؤں نے دینی محاذ پر اپنی شکست کو تو عملی طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ اب یہ لوگ "تقویۃ الایمان" کا کم سے کم ذکر کرتے ہیں، برسرِ عام حضور کو "مر کر مٹی میں مل جانے والا" کہنے کی جسارت نہیں کر سکتے اور اسی طرح یہ لکھتے اور کہتے نہیں کہ "حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نظیر دوسرا پیدا ہو سکتا ہے"۔ اب انہوں نے اسمٰعیل دہلوی، سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی "مجاہدین" کے جہاد کا رُخ سکھوں اور مسلمانوں سے موڑ کر انگریزوں کی طرف کر دیا ہے اور انہیں انگریزوں کے دشمن اور آزادی کے عظیم رہنما "ثابت" کرنے کے لیے دھڑا دھڑ کتابیں اور مضامین لکھ رہے ہیں۔ نیز علامہ فضل حق خیرآبادی سے دینی محاذ پر شکست کھانے کے بعد ان کے سیاسی کردار پر پردے ڈالنے کی کوشش شروع کر دی ہے ؎

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

چونکہ انہوں نے صرف یہ طے کیا ہوا ہے کہ فضل حق سے جنگِ آزادی کی زمام چھیننی ہے، چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے کوئی تو یہ کہتا ہے کہ انہوں نے محض انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا، کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا؛ کوئی اور قابلِ قدر خدمت انجام نہیں دی۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ فتویٰ تو

انہوں نے دیا ہی نہیں اور فضل حق شاہجہانپوری کے بجائے غلطی سے انہیں پکڑ کر کالاپانی کی سزادی گئی تھی، جہاں وہ شہید ہو گئے تھے۔

ان "تاریخ سازوں" میں سے کچھ تو جنگِ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے فضلِ حق خیرآبادی کا نام بھی لینا گوارا نہیں کرتے۔ کبھی "امتناع النظیر" کے مسئلے میں فضلِ حق خیرآبادی کو آپ نے گالیاں دیں، وہی کافی تھیں کہ سیاست میں ان کے مہتاب زا کردار کو دھندلانے کی کوشش بھی کی جارہی ہے ؎

بہتان تراشی کی ضرورت نہیں لوگو!
دینے کو سزا جرم محبت ہی بہت ہے

مشہور ادیب و نقاد نادم سیتاپوری لکھتے ہیں:

"انگریز اور ان کے ہوا خواہ تو مولانا (فضلِ حق خیرآبادی) سے اس لیے ناراض تھے کہ انقلاب سن ستاون کے سلسلے میں کسی نہ کسی نہج سے ان کا نام آ گیا، لیکن خود مسلمانوں کا ایک "پروپیگنڈسٹ گروپ" مولانا سے اس لیے بیزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔ یہ باوقار علمی مباحثے کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیرآبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا، لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔"

"غالب نام آورم" ص ۱۰۱
از نادم سیتاپوری

مزید لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے کئی سیرت نگاروں نے من گھڑت، جھوٹی اور بے سروپا حکایتیں بیان کر کے مولانا کے نیک کردار کو خواہ مخواہ مشتبہ کرنے کی کوشش کی ہے۔" (غالب نام آورم ص ۱۰۹)

اس سلسلے میں ناؔدم سیتاپوری نے مفتی انتظام اللہ شہابی کے بارے میں لکھا ہے :

" جھوٹی روایات، من گھڑت واقعات اور فرضی کتابوں کے غلط حوالے مفتی صاحب کی ادبی زندگی کا شاندار کارنامہ رہا ہے۔" (ص ۱۰۹)

پھر انہوں نے مفتی صاحب کے علامہ فضل حق پر کئی اعتراضات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ ہم علامہ فضل حق اور اسمٰعیل دہلوی کے تقابلی جائزے کے لیے ان دونوں شخصیتوں کے سیاسی کردار کو سامنے لائیں گے اور بتائیں گے کہ انگریزوں کو برصغیر سے نکالنے کے لیے کس نے کیا کیا ہے؟ اور انگریزوں کا اقتدار اس سرزمین پر مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے کون کس طرح سرگرم کار رہا اور کس نے انگریزوں کے دشمنوں سے برسرپیکار ہونے کو اپنی زندگی کا مطمح نظر قرار دیا اور انشاءاللہ العزیز کوئی بات بے دلیل اور بلا جواز نہیں کہی جائے گی۔ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی صاحبان کے بارے میں انہی حضرات کی کتابوں اور مضامین کے حوالے دیئے جا رہے ہیں، جن کے یہ ممدوح ہیں۔ قارئین کرام تلاش حق کے جذبے سے ان سطور کو پڑھیں ؎

تو مپندار کہ ایں قصہ زخود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

اس مقالے کے مطالعے سے قارئین کرام پر واضح ہو گا کہ جہاں فضل حق خیر آبادی انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں، اس کی سزا بھگتتے ہیں، وہاں اسمٰعیل دہلوی اور ان کے پیر و مرشد سید احمد بریلوی انگریزوں کی دعوتیں اڑاتے ہیں۔ ان کی عملداری میں اطمینان سے زندگی گزارنے پر شکر ادا کرتے ہیں۔ ان کے ایما پر سکھوں سے جہاد کو نصب العین ٹھہراتے ہیں۔ ایسے میں برصغیر کی آزادی کی تاریخ میں جب یہ لوگ اپنے ان مجاہدین کا ذکر کرتے ہیں، تو ہنسی آتی ہے ؎

مثال ایسی ہے اس دَورِ خرد کے ہوشمندوں کی
نہ ہو دامن میں ذرّہ اور صحرا نام ہو جائے

علامہ فضلِ حق کے مقابلے میں اسمٰعیل دہلوی کی بات کے ساتھ خواہ مخواہ سید احمد بریلوی کا نام لیا جاتا ہے ان [illegible] سید عابدین سے عقیدت طلب ہوں۔ اصل میں اس کی وجہ یہ ہے کہ "تحریکِ مجاہدین" کے عقلِ کل اگرچہ اسمٰعیل دہلوی ہی تھے، مگر ظاہری سربراہ سید احمد بریلوی تھے اور "تحریکِ مجاہدین" کے نام سے جو کچھ اس برصغیر میں کیا گیا اس میں ان دونوں کی حیثیت لازم و ملزوم کی ہے، جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے "نبوّت" کا دعویٰ کیا تھا، مگر حقیقت میں اسے "نبی" بنانے والے کا نام حکیم نورالدین بھیروی تھا۔ مرزا صاحب کا مبلغِ علم تو سب لوگوں پر عیاں ہے۔ اسی طرح سید احمد صاحب نے اپنے آپ کو "مامور من اللہ" کہا ہے۔ بقول ان کے ان پر "الہام" بھی ہوتا تھا، انہیں خدا نے فتح و نصرت کی بشارت بھی دی تھی۔

مکتوب ۶ بنام خان خاناں خلجائی:

"اس فقیر کو بارہا پردۂ غیب سے وارد ہونے والی روحانی باتوں اور ربّانی الہام کے ذریعے جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے دفعیہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے اور چونکہ الہامی وعدے اس بادشاہِ حقیقی کے کلام کے مطابق ہوا کرتے ہیں، اس لیے ان کو ضرور مان لینا چاہیئے اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔" (مکتوباتِ سید احمد شہید (مرتبہ جعفر تھانیسری، مترجم سخاوت مرزا، ص ۵۰)

"مولوی اسحاق گورکھپوری سے روایت ہے کہ سید صاحب نے فرمایا تھا کہ مجھ کو غیب سے الہام ہوا تھا کہ تیرا نسب صحیح ہے۔" (مقدمہ مرتبات حیاتِ سید احمد شہید از محمد ایوب قادری ص ۱۵)

یوں انہوں نے الہام کا اعلان تو کیا، لیکن اس کی مہلت ہی نہیں ملی کہ وہ نبوت کا باقاعدہ دعویٰ کر سکتے، ورنہ شاید ہم غلام احمد قادیانی کے بجائے سید احمد بریلوی اور ان کے متبعین کا نبی اور پیروانِ نبی کی حیثیت سے بطلان کر رہے ہوتے۔ ان دونوں (مرزا غلام احمد اور سید احمد) میں یہ قدر مشترک بھی تھی کہ دونوں پڑھنے لکھنے میں کند ذہن واقع ہوتے تھے۔

"بزرگ سید احمد بچپن میں اپنے غیر معمولی سکوت کی وجہ سے پرلے درجے کا غبی مشہور ہوگیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ اسے تعلیم دینا بے سود ہے کبھی کچھ آئے جائے گا نہیں۔"

"حیاتِ طیبہ" از مرزا حیرت دہلوی، مطبوعہ فاروقی دہلی ص ۲۷۱)

یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے اور اپنے ان پڑھ "پیر و مرشد" کی جہالت کو (نعوذ باللہ) محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال مشابہت بھی قرار دے۔

"آپ (سید احمد صاحب) کی ذات والا صفات ابتداء فطرت سے جناب رسالت مآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات) کی کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی۔ اس لیے آپ کی لوحِ فطرت علومِ رسمیہ کے نقش اور تحریر و تقریر کے دانشمندوں کی راہ و روش سے خالی تھی۔"

صراطِ مستقیم از اسمٰعیل دہلوی ص ۳، مطبوعہ مطبع احمدی لاہور)

اسی کتاب کے صفحہ ۷۳ پر صدیقیت کی آڑ میں دعوئ نبوت کیا گیا ہے۔ اس پر بھی انہیں "علماء" کی قیادت اور زمانے کی سیادت کا دعویٰ تھا۔

پھر سید احمد صاحب کے سب سے بڑے نام لیوا محمد جعفر تھانیسری اپنی کتاب "سوانحِ احمدی" میں "بیان خلفاء حضرت سید احمد صاحب" میں رقم فرماتے ہیں:

"اوّل اور افضل سارے خلیفوں کے مولوی عبدالحی صاحب داماد حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے ہیں۔ دوم مولوی مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے آپ کے یارِ غار اور جاں نثار تھے۔" (سوانحِ احمدی از محمد جعفر تھانیسری، ص ۱۴۰)

ملاحظہ فرمایا آپ نے، مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی بالکل اسی طرح اپنے ساتھیوں کو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما وغیرہ گردانا، اپنی بیوی کو ام المومنین کہا اور ان کے ماننے والے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دینِ برحق کے مقابلے پر

اسی طرح ایک نیا دین کھڑا کرتے ہیں، جس طرح سید احمد کی اٹھان ہے۔ انہی لوگوں نے کہا: "اگر حضور جیسے اور نبی آجائیں، تو بھی حضور کی خاتمیت میں کوئی فرق نہیں آتا"۔ شاید مصلحتوں نے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول نہیں کی کہ کیا یہ سب کچھ نئے نئے نبی پیدا کرنے کی خواہش کا اثر تو نہیں؟ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

میں کہنا تو یہ چاہتا ہوں کہ چونکہ تھانیسری صاحب کے بقول سید احمد اور اسمٰعیل دہلوی میں (نعوذ باللہ) محمد و عمر کا تعلق ہے، اس لیے مجھے معاف کیا جائے۔ اگر اسمٰعیل صاحب کے ذکر میں ناگزیر طور پر سید احمد صاحب کا ذکر آجائے۔

میں نے جن دوستوں سے اپنے اس مضمون کا ذکر کیا انہوں نے کہا کہ معاندینِ حق کے قلمکاروں کی تعداد زیادہ ہے، ان کے ہاتھ میں قلم ہے، ذرائع ابلاغ پران کا کنٹرول ہے، ان کے اپنے بہت سے رسالے ہیں، وہ سب تم پر پل پڑیں گے، مگر میں حق کہنے کی آرزو کا گلا نہیں دبا سکا۔ جو شخص جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس پر کوئی قدغن نہیں اور وسائل کی کثرت اگر انگیخت بھی کرے گی تو چشمِ ما روشن، دلِ ما شاد، مجھے پیروانِ اسمٰعیل دہلوی سے اس بات کی توقع نہیں کہ وہ حقیقت کو قبول کرلیں گے ع این خیال است محال است و جنوں

؎ اس دشت میں قدموں کے نشاں ڈھونڈھ رہے ہیں
پیڑوں سے جہاں چھن کے ضیا تک نہیں آتی

وہ تو حقائق سے واقف ہیں، جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور لوگوں کی نگاہوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں، مگر طالبانِ حق اس امر کی طرف ضرور توجہ دیں کہ میں حوالے انہی لوگوں کی تصانیف سے نقل کر رہا ہوں، اب ان کی باتیں دہرانے پر بھی ہدفِ طعن و تشنیع بنایا جاتا ہے تو "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"

؎ اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

جنگِ آزادی

اور

فضلِ حق خیرآبادی

صاحبِ علم و فضل

دیکھتے کیوں ہو شکیبؔ اتنی بلندی کی طرف
نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دینی مسائل پر گفتگو کرنا میرے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ میں زیرِ نظر مقالے میں علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کی سیاسی سرگرمیوں کو زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں، اس لیے علمی مسائل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ بتاتا ہوں کہ مشہور اہلِ علم و دانش حضرات کے علاوہ علامہ فضلِ حق کے مخالف بھی ان کے علم و فضل کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں:

"انقلاب سن ستاون سے پہلے دہلی کی ادبی فضا جن عناصر اربعہ سے ترتیب پا رہی تھی، وہ یہی چار ہستیاں تھیں: مولانا خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مرزا غالب اور حکیم مومن۔" (غالب نام آورم ص ۸۱)

نادم سیتاپوری

سر سید احمد خاں علامہ فضلِ حق سے دینی اور سیاسی ہر دو لحاظ سے مختلف رائے اور عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن ملاحظہ فرمائیے کہ ان کے دل و دماغ پر علامہ کی دانش و حکمت کے اثرات کتنے گہرے ہیں:

"جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہی کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا، دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ بایں ہمہ کمالاتِ علم و ادب میں ایسا عَلَمِ سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی شستہ تحریر عروج معارج ہے اور

بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندیِ معارج ہے۔ سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایۂ خوش بیانی اور امراء القیس کو ان کے افکارِ بلند سے دستگاہِ عروجِ معانی، الفاظ پاکیزہ ان کے رشکِ گوہر خوش آب اور معانی رنگیں ان کے غیرتِ لعل ناب، سَرو اُن کی سطورِ عبارت کے آگے پا بہ گِل، اور گُل ان کی عبارتِ رنگیں کے سامنے خجل، نرگس اگر ان کے سواد سے نگاہ ملا دیتی، مصحفِ گل کے پڑھنے سے عاجز نہ رہتی، اور سوسن اگر ان کی عبارتِ فصیح سے زبان کو آشنا کرتی، صفتِ گویائی سے عاری نہ ہوتی۔"

(آثار الصنادید از سر سید احمد خاں، ص ۲۸۱)

مولوی رحمان علی، علامہ فضلِ حق کے معاصر تھے، وہ منطق، فلسفہ، حکمت، ادب، کلام اور اصول اور شاعری میں فضلِ حق کے تخصص اور امتیاز کے متعلق بتاتے ہوئے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ان کے کردار اور اس کے نتیجے میں ان کی قید اور شہادت کا ذکر کرتے ہیں؛

"در علومِ منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران و استحضائے فوق البیان داشت، نظمش زاید بر چہار ہزار اشعار خواہد بود... انگریزان او را بزمانۂ فساد ہند قید کردہ بہ جزیرۂ رنگون فرستادند، ہم دراں جا بتاریخ دوازدہم صفر سال دوازدہ صد و ہفتاد و ہشت ہجری وفات یافتہ۔"

("تذکرۂ علمائے ہند" از مولوی رحمان علی)

(مطبع نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۹۱۴ء ص ۱۶۴ / اردو ترجمہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سنہ ۱۹۶۱ء ص ۳۸۲،۸۳)

"آبِ حیات" از محمد حسین آزاد ص ۵۱۲ / اور "یادگارِ غالب" ص ۱۰۲ میں ہے؛

"مولانا فضلِ حق اور مرزا خانی نے دیوانِ غالب سے مشکل اشعار خارج کر دیئے اور دو ثلث کے قریب حصّہ نکال دیا اور ان کی رہنمائی سے غالب نے اس روش پر چلنا ترک کر دیا۔"

اسد اللہ خاں غالب پر مولانا فضلِ حق کے اثرات کا ذکر دوسری کئی کتابوں میں بھی تواتر و تسلسل کے ساتھ کیا گیا ہے، مثلاً:

"اگر مولوی فضلِ حق اور ان کے رفقاء کی صحبت کا نقطہ اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ (غالب) شاعری میں اپنی غلط روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آجاتے، تو یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی، مگر اس سے بھی زیادہ قابل قدر کام غالب کی "اخلاقی اصلاح" کا ہوا۔"

("ذکرِ غالب" از مالک رام، ص ۳۴)

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی فضلِ حق، غالب کے سب سے بڑے محب اور محسن تھے، انہوں نے نہ صرف مرزا کی شعر و سخن کے میدان میں رہنمائی کی، جو ان کا اصل دائرۂ عمل تھا، بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی۔"

("غالب نامہ" از شیخ محمد اکرام، ص ۵۴)

(بحوالہ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" از نادم سیتاپوری ص ۲۹، ۲۸)

"جن (مرزا غالب) کی نظر میں بڑے بڑے شعراء علماء نہیں جچتے تھے، مولانا (خیرآبادی) کی بڑی تعظیم اور عزت کرتے تھے، چنانچہ جب وہ دہلی سے سررشتہ داری عدالت چھوڑ کر جانے لگے، تو مرزا نے "آئینہ سکندر" میں اشاعت کے لیے ایک تحریر بھیجی، جس کا آخری جملہ یہ ہے: "حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و بینش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہندکہ از صد یک وامانند و باز آں پایۂ را بہ سررشتہ داری عدالت دیوانی سنجند ہنوزیں عہدہ دروں مرتبہ و لے خواہد بود۔"

("سرگزشتِ غالب" از ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص ۵۹)

(غالب نے) انہی کی نسبت یوسف مرزا کے نام ایک خط میں لکھا: مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ مجھ سے تم معلوم کرو، مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا۔

بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور (کالاپانی) کی طرف روانہ کرو" اکتوبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں منشی داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں: ہاں خان صاحب! آپ جو کلکتے پہنچے اور سب صاحبوں سے ملے، تو مولوی فضلِ حق کا حال اچھی طرح سے دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے میں اس کا کیا حال ہے؟" (غالب نامہ از شیخ محمد اکرام ص ۱۴۱، ۱۴۰)

مرزا غالب مولانا خیرآبادی کے ارتحال پر شیخ لطیف احمد بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"کیا لکھوں اور کہوں، نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور، ہاتھ میں رعشہ طاری ہے، کان سماعت سے عاری ہے" ؎

عنابِ عروساں در آمد بجوش

صراحی تہی گشت وساقی خموش

فخرِ ایجاد و تکوین مولانا فضلِ حق ایسا دوست مرجائے، غالب نیم مردہ، نیم جاں رہ جائے ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی

موت آتی ہے، پر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی

اب کسی بات پر نہیں آتی"

(ماہنامہ اُردوئے معلّٰی علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء، ص ۳۲)

جب تک اہلِ قلم کے ذہن و احساس پر محدود حزبی مفادات نے یلغار نہ کی تھی اور اس کے لیے انہوں نے تاریخ کو مسخ کرنے کا عمل شروع نہیں کیا تھا۔ اہلِ دانش کے قلم اور زبان سے اس جید عالم اور بے مثل و بے نظیر فاضل شخصیت کے حق میں لکھا اور کہا جاتا رہا۔ مولوی محمد الدین "روضۃ الادباء" میں لکھتے ہیں:

"مولوی فضل حق بن مولوی فضل امام خیرآبادی عالم اجل اور فاضل بے بدل حاوی فروع و اصول وجامع معقول و منقول تھے ...... اساتذۂ وقت آپ کی شاگردی فخر جانتے تھے ...... مولانا کو علم فلسفہ اور ادب میں ید طولیٰ تھا ... دہلی میں آپ عہدۂ جلیلہ اور منصبِ عظیمہ پر متقرر تھے اور سرکارِ انگلشیہ کی قید میں جزیرۂ انڈیمان میں، جس کو "کالا پانی" کہتے ہیں جا کر ۱۲۷۸ھ میں فوت ہو گئے۔"

(روضۃ الادباء، ص ۱۴۸)

پاکستان کے نامور محقق ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور سندھ و پاک کے عظیم نقاد و دانشور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی سرکردگی اور نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی کے عظیم منصوبے "اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ" میں مولانا فضل حق کے متعلق بزمی انصاری نے لکھا ہے:

"۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی تو مولوی فضل حق نے اس بغاوت میں نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا اور عمر قید کی سزا پائی۔"

(اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد ۱۵، ص ۳۷۵)

سید سلیمان ندوی نے علامہ کے فضل و شرف کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ ان کے سیاسی کردار کی عظمت کے نقوش کتنے گہرے ہیں:

"مرحوم (مولانا فضل امام) کے جانشین، صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تھے جن کے دمِ عیسوی نے معقولات میں روح پھونکی کہ ابن سینا کے وقت مشہور ہوئے۔ دیارِ اطراف سے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق و فلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرۂ انڈیمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علومِ معقول کو بڑی رونق دی اور بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے۔" ("حیاتِ شبلی" از سید سلیمان ندوی، ص ۲۳، ۲۲)

اپنے عہد کے اس عظیم صاحب علم و دانش کے فضل و ہنر کے ساتھ ان کی سیاسی خدمات کے متعلق محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں :

"علامہ فضل حق نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف سخت حصّہ لیا جس کے نتیجے میں گرفتار کرکے کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ جہاں اس فاضل اجل عالم بے بدل نے نہایت کسمپرسی، بے بسی اور لاچاری کی حالت میں ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا اور علم و دانش اور فضل و ہنر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا"

(حاشیہ مولانا مخدومنا مولوی فضلِ حق، مقالاتِ سرسید، حصّہ شانزدہم ص ۳۲۰)

منشی محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی کو بھی جنگِ آزادی میں حصّہ لینے کی پاداش میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی ان کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"انڈمان میں زیادہ وقت مولانا فضلِ حق کی صحبت میں گزرتا تھا، چنانچہ آپ کے متعلق ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

رشک زلیخا ہوئی بحرِ صفت جوش تن ۔۔۔ غرق ہوا نیل ہیں یوسفِ گل پیرہن

مخزن فضل و کمال، عالمِ عالی مقام ۔۔۔ ناقدِ تازی زباں، فیض شناس سخن

مولوی بے نظیر فضلِ حق اسم شریف ۔۔۔ دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن

قید میں، میں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ ۔۔۔ عین سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن

نصف قصیدہ کیا ہے سامنے ان کے رقم

ختم ہوا جب تھے وہ ہمدمِ گور و کفن"

(غدر کے چند علماء، ص ۷۶، ۵۷)

انگریزوں کے خلاف

فتوائے جہاد

کس نے اپنے دل کے لہو سے لالہ و گل میں رنگ بھرا
جن کو دعویٰ ہو گلشن پر ہم سے آنکھیں چار کریں

آج کچھ لوگوں نے تاریخی حقائق پر پردہ ڈالنے اور جنگِ آزادی کے مسلمہ رہنماؤں کے خلاف فضا پیدا کرنے کی کوشش میں یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ علامہ فضل حق خیر آبادی نے نہیں دیا تھا۔ مالک رام کہتے ہیں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پر علامہ کے دستخط نہیں تھے۔ محمد ایوب قادری بھی اپنا سارا "زورِ تحقیق" اسی پر صرف کرتے ہیں۔ ان کے اس مفروضے کی تردید میں حکیم محمود احمد برکاتی نے "فضل حق اور سن ستاون" میں مسکت دلائل و براہین سے اس کے تار و پود بکھیرے ہیں۔ ان لوگوں نے بہت چاہا کہ فضل حق خیر آبادی کی قربانیوں پر اپنی مصلحتوں اور مخالفتوں کے پردے ڈالیں، مگر ان کے کردار کی پختگی عزم کی سلامتی اور استقلال و ہمت کی جزئیات پر نظر ڈالیں، تو یقین آتا ہے ؂

آکے گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

میں آپ کو صرف علامہ کے فتوے کی صدائے بازگشت سناتا ہوں:

"علماء نے جس جس طرح بغاوت کو منظم کیا، اس کو مفصل بیان کرنے کے لیے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے، مگر ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات پر کیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت سے بڑے بڑے مورخ بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ علماء عوام میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی تحریر و تقریر کا بڑا اثر ہوتا تھا، چنانچہ

دہلی میں جنرل بخت خان کی تحریک پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء نے جو جہاد کا فتویٰ دیا، اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔"

(جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، از خورشید مصطفیٰ رضوی ص ۵۵۴)

غلام رسول مہر یہ بات غلط ثابت کرنے کے زعم میں کہ مولانا فضل حق ہی کے دم سے جنگِ آزادی کی تحریک میں جان پڑ گئی تھی، یہ بھول گئے کہ وہ فتویٰ کی تائید کر کے اپنوں کی نگاہوں میں بھی مطعون ہو رہے ہیں۔ اسمٰعیل دہلوی کے یہ مداح بہرحال کسی نہ کسی طرح اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ فتویٰ کے سلسلے میں فضل حق کی کارکردگی سب سے نمایاں ہے اور وہ نہ ہوتے تو اس فتویٰ کا وجود ہی نہ ہوتا۔

"مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے، تو مسلمانوں کو جنگِ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علماء دہلی کے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انہی نے علما کے نام تجویز کیے، جن پر دستخط لیے گئے۔"

("۱۸۵۷ء کے مجاہد" از غلام رسول مہر، ص ۲۰۶)

پاکستان کے نامور شاعر ناصر کاظمی اور مشہور کالم نویس انتظار حسین کی ادارت میں شائع ہونے والے مجلہ "خیال" کے سن ستاون نمبر میں شکور احسن صاحب مفتی صدر الدین آزردہ پر مضمون لکھتے ہوئے علامہ کے فتویٰ جہاد کا ذکر کرتے ہیں:

"جب برطانوی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض شاعروں ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہو جانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ مولانا فضل حق کو جہاد

کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈیمان بھیجا گیا۔ صہبائی کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا، شیفتہ کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔"

("خیال" لاہور، حسن ستادن نمبر، ص ۲۶۸)

مفتی صدرالدین آزردہ ہی کے بیان میں مفتی انتظام اللہ شہابی فتویٰ جہاد کی تیاری کی ساری ذمہ داری مولانا فضل حق پر ڈالتے ہیں:

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں رونما ہوا، مولانا فضل حق الور سے دلی آئے۔ جنرل بخت خاں نے نقشۂ اقتدار جما رکھا تھا۔ استفتاء مولانا نے لکھا۔ مفتی صاحب و دیگر علماء نے فتویٰ دیا .... مولانا فضل حق کو اقرارِ جرم پر انڈمان جانا پڑا۔"

("غدر کے چند علماء" از انتظام اللہ شہابی، ص ۴۸)

رئیس احمد جعفری تمام عمر آزادی کی تحریک کی جزئیات کھنگالتے رہے، وہ اپنی ضخیم کتاب "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" میں لکھتے ہیں:

"مولانا فضل حق خیر آبادی علمی قابلیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، ان کو فتویٰ جہاد کی پاداش اور جرم بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا۔"

("بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" از رئیس احمد جعفری، ص ۳۱۵)

جب بھی کوئی مؤرخ تاثرات و تعصبات سے قطع نظر کر کے، ۱۸۵۷ء کا حال لکھے گا، تو مجبور ہوگا کہ علامہ فضل حق کے فتویٰ جہاد کا ذکر کرے۔ محمد اسمٰعیل پانی پتی اپنے مضمون "۱۸۵۷ء میں علماء کرام کا حصہ" میں فضل حق کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ عظیم دہلی میں رونما ہوا، تو (علامہ فضل حق خیر آبادی) فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر انچیف افواج ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت اور امداد کی .... لکھنؤ میں ان پر مقدمہ قائم ہوا، نہایت بیباکی اور صفائی کے ساتھ بغیر ذرہ بھر ہچکچاہٹ اور تذبذب کے اقرار کیا کہ ہاں

میں نے فتویٰ لکھا اور اس پر دستخط کیے اور جو کچھ میں نے کیا، اپنے خیال میں ٹھیک کیا۔" (لیل و نہار" لاہور۔ جنگ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء، ص ۲۸)

پاکستان کے مشہور جریدہ "تحقیق الزبیر" کے تحریک آزادی نمبر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

مولانا فضل حق نے جامع مسجد میں فتویٰ پڑھ کر سنایا۔ علماء سے دستخط کروائے، اس فتوے کی اشاعت سے جدوجہد آزادی میں زور پیدا ہوا، اور آخر میں مقدمہ کے موقع پر علامہ فضل حق نے اس بات پر اصرار کیا کہ یہ فتویٰ انہوں نے لکھا ہے اور اب تک اپنی رائے تبدیل نہ کرنے کا اعلان کرتے ہیں:

"مولانا فضل حق نے ایک دن بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا، تو بہتوں کے لیے باعث تشویش بنا۔ اس فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ اور دوسرے پانچ علماء کے دستخط تھے، اس کا شائع ہونا تھا کہ جدوجہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے۔۔۔۔ تاریخ ذکاء اللہ کے مطابق اس فتوے کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی ۔۔۔۔۔ سرکاری وکیل کے مقابلے میں انہوں نے خود بحث کی اور سب الزام ایک ایک کرکے رد کر دیئے، لیکن فتوے کے بارے میں آخر تک اڑے رہے کہ وہ فتویٰ صحیح ہے اور میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے یہی ہے۔"

(سہ ماہی "الزبیر" بہاولپور، تحریک آزادی نمبر ۱۹۷۰ء، ص ۹۲)

مفتی انتظام اللہ صاحب نے علامہ فضل حق کے خلاف بہت کچھ لکھا جس کا خود نادم سیتاپوری جیسے ادیب نے بھی نہایت دکھ کے ساتھ اظہار کیا ہے اور دلائل کے ساتھ ان کے الزامات کی تردید بھی کی ہے، مگر علامہ کے فتوئ جہاد کے تو وہ بھی منکر نہیں ہوئے۔ اصل میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مقصد ان سب حضرات کا ایک تھا، جو نیک نہیں تھا کہ فضل حق کے خلاف لکھا جائے اسی لیے ان کے خیال و فکر میں مطابقت نہیں پائی جاتی اور کسی نہ کسی پہلو سے کسی نہ کسی منہ سے سچی

بات کبھی نہ کبھی نکل ہی جاتی ہے۔ مفتی انتظام اللہ "علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں" کے صفحہ ۵۶ پر لکھتے ہیں:

"ادھر جنگ ... مولوی احمد شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آکر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف علماء میں سرگرمی عمل پیدا کر رہے تھے۔ مولانا فضل حق بھی ان کے ہمنوا ہو گئے اور سرکاری ملازمت ترک کر کے الور چلے گئے۔ ہنگامہ ۵۷ء رونما ہوا، دلّی آئے، بہادر شاہ سے ملے۔ یہاں جنرل بخت خان کے ٹھاٹھ جمے ہوئے تھے۔ نصاریٰ کے خلاف جہاد کا فتویٰ مولانا نے دیا اور اس پر مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبر آبادی وغیرہ کے دستخط کرائے گئے۔"

"جج کے سامنے آپ کی موجودگی میں سرکاری گواہ پیش ہوا، اس نے آپ کو دیکھ کر کہنے لگا "یہ وہ فضل حق نہیں ہیں جنہوں نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا، وہ دوسرے ہیں" آپ فوراً بول اٹھے "پہلی اطلاع اس کی صحیح ہے، اب غلط کہہ رہا ہے۔ مجھ پر جو جرم عائد کیا گیا ہے، وہ درست ہے۔ میں نے ہی فتویٰ لکھا اور آج بھی میری رائے وہی ہے" جج نے حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا تجویز کی جو بخندہ پیشانی قبول فرما کر انڈمان گئے۔"

یہی مفتی صاحب اپنی دوسری کتاب میں بھی علامہ کے فتویٰ کے حق میں فتویٰ دیتے ہیں:

"مولانا نے اپنے اوپر کے بقیہ الزام رد کرنے کے بعد پلٹا کھایا اور کہا جس مخبر نے فتوے کی خبر کی اس کے بیان کی اب میں توثیق کرتا ہوں۔ میرا ہی لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورے سے علماء نے دستخط کیے، پہلے اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی، مگر اب عدالت کے سامنے میری صورت سے مرعوب ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور جانا ہے، غلط بات منصب کے معاملے میں نہیں

بول سکتا۔" (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء" از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۵۲)

مکتبہ بُرہان دہلی کی شائع کردہ کتاب "جنگِ آزادی اٹھارہ سو ستاون" از خورشید مصطفےٰ رضوی میں ہے:

"کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء قریب آنے پر آپ (فضل حق) نے اکثر والیانِ ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اگست ۵۷ء میں دہلی آگئے اور یہاں جنرل بخت خاں کی تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا۔ جس سے مسلمانوں میں بیحد جوش و خروش پیدا ہو گیا۔"

لکھنؤ میں مقدمہ چلا جس میں حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مولانا بری ہو جائیں، مگر آپ نے برسرِ عدالت کہہ دیا کہ "میں نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور آج بھی میری وہی رائے ہے۔"

(جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، ص ۵۸، ۴۵۷)

علامہ فضلِ حق کی کتاب "الثورۃ الہندیہ" کے اُردو ترجمے کے مقدمہ میں لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اورنٹیلسٹ محمد عبدالشاہد خاں شروانی لکھتے ہیں:

"اس رسالہ کو دیکھنے سے اس وقت کے خوفناک حالات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی رعایا کے گلے میں دائمی غُلامی اور نصرانیت کا پٹہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور علمائے مجاہدین کا ایسے موقع پر اعلانِ جہاد کس قدر بروقت اور ضروری تھا۔ علامہ خیرآبادی کا رجب ۱۲۷۵ھ میں باطل قوتوں کے سامنے یہ اعلانِ حق ہمیشہ آبِ زر سے لکھا جاتا رہے گا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔" (مقدمہ "باغی ہندوستان" از محمد عبدالشاہد خاں شروانی، مطبوعہ مکتبہ قادریہ۔ اندرون لوہاری دروازہ لاہور)

جن لوگوں نے بوجوہ فضلِ حق کو عظمت و استقلال کی مسندِ جلیلہ سے ہٹانے اور ان کے کارنامے کو لوگوں کے دماغوں سے محو کرنے کی خاطر خامہ فرسائی کی ہے ـــــ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ان کے خیالات میں تطابق نہیں ہے، لیکن حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ پروفیسر محمد ایوب قادری جو آجکل پاکستان میں علامہ فضلِ حق کے فتویٰ جہاد کے سب سے بڑے "دشمن" ہیں، وہ بھی اپنی ایک کتاب میں ان کے فتوے کو تسلیم کرتے ہیں۔ بعد میں شاید کسی خاص وجہ سے انہوں نے حق کی راہ پر چلنے کی روش پر نظرِ ثانی کر لی اور اب دوبارہ حق کو قبول کرنے کی راہ میں "وقت کی ضرورت" یا ان کی انا حائل ہے ؎

اے کہ می گوئی کہ می آیم ، نمی آئی چرا

پائے شوقت را مگر رنگِ حیا زنجیر پاست

"دہلی میں بہادر شاہ ظفر نے خود مختاری کا اعلان کر دیا مولانا فضلِ حق خیر آبادی نیز دوسرے علمائے دہلی میں موجود تھے .... جنرل بخت خاں کے مشورے سے علامہ فضلِ حق خیر آبادی نے بعد نمازِ جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت و ضرورت پر تقریر کی اور جہاد کا استفتاء مرتب کر کے پیش کیا۔ جہاد کے فتویٰ کی تیاری میں جنرل بخت خان کی کوشش خاص تھی" (جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد" مولانا فیض احمد بدایونی)

(از محمد ایوب قادری، ص ۲۲، ۲۱)

پاکستان کے مشہور محقق ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے جنگِ آزادی میں صرف "لبِ بام سے تماشہ دیکھنے والوں کو یاد دلایا ہے کہ علامہ فضلِ حق بے خطر اس آگ میں کود پڑے تھے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ سر دار بھی اعلانِ حق سے باز نہ آنے والے علامہ فضلِ حق جو قدم اٹھا چکے تھے اور جو کچھ کہہ چکے تھے، اس پر آخر دم تک قائم رہے ؎

بات بن سکتی نہیں کوئی صداقت کے بغیر

تیر کی پشت پہ کردار کماں ہوتا ہے

ڈاکٹر ابواللیث اپنے مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی" میں کہتے ہیں:

"مسلمانوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لیے آخری مرتبہ جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرنے کے لیے ایک باقاعدہ فتویٰ جہاد کا جاری کیا گیا، جس پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی فضل حق بھی شریک تھے۔ مولانا فضل حق نے فتوے کے بعد جگہ جگہ دورے کیے اور بالآخر دہلی پہنچ گئے۔ اس زمانے میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا اندازہ جیون لال کے روزنامچے سے ہوتا ہے جس میں اس نے مختلف تاریخوں میں مولانا کا قلعے کی مجلس مشاورت میں شریک ہونا بیان کیا ہے۔ مولانا فضل حق کے مشورے صرف قلعۂ معلّی کی پوشیدہ مجلسوں تک محدود نہ تھے۔ وہ جنرل بخت خاں سے ملے، مشورے ہوتے اور آخر میں بعد نماز جمعہ دلّی کی لال مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی اور فتویٰ پیش کیا۔"

(خیال' لاہور، سن ستاون نمبر ص ۲۶۳، ۲۶۳)

پاکستان میں دیوبند مکتبہ فکر کے آرگن ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کے ایک مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"بڑا ہوتا ریخ کا، اس نے اپنے حافظے سے ایسی ایسی جانباز، حق گو، بہادر اور جامع کمالات شخصیتوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا، جنہوں نے اپنے دور میں وقت کے تیز و تند طوفانوں سے بے خوف و خطر ٹکر لی اور پیٹھ نہیں دکھائی — مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جواں مرد اور نڈر مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا، مگر تاریخ کے صفحات میں ان کو شایانِ شان کیا، کوئی معمولی جگہ بھی نہیں مل سکی ......

مولانا فضل حق خیرآبادی نے اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ کا فریضہ ادا کیا اور اپنی عمر عزیز انڈمان میں حبس دوام کی نذر کر دی ......

علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا۔۔۔۔

مولانا فضل حق بھی "باغی" قرار دیئے گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری فتوئ جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ کر کے سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔"

(مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی" از مستقیم احسن حامدی فاضلِ دیوبند ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۲۳ رنومبر ۶۲ء ص ۱۰، ۹)

جناب حسین احمد مدنی ان سب محققین کے ممدوح ہیں جو اپنے آپ کو فضل حق کی مخالفت پر مامور سمجھتے ہیں۔ آپ ان کی تحریر کا لطف اٹھایئے اور دیکھئے کہ خدا کے شیر کی گرج کیا رنگ دکھاتی ہے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کی استقامت کا حال حسین احمد مدنی کی زبانی سنیئے، علامہ فضل حق اپنے فتوئ جہاد پر مفتخر ہیں اور اس الزام سے برّیت کے بجائے اس کی پاداش میں ہر سزا بھگتنے کے لیے ہمہ تن تیار:

"مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے، ایک ایک کر کے سب رد کر دیئے، جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی تھی۔ اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی۔ فرمایا "پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی، اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا، وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"۔۔۔۔۔ جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مخبر تو عدالت کا رخ اور علامہ کی باحمیت و پُروقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا، مگر علامہ کی شانِ استقلال کے

قربان جائیے، خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے "وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے،
اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔" سے

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود"

(نقش حیات از حسین احمد مدنی، ص ۴۶۲)

حسین احمد مدنی صاحب اپنی دوسری کتاب "تحریک ریشمی رومال" میں پھر اس شیرِ حق کی شانِ استقلال پر قربان ہو رہے ہیں۔ فضلِ حق نے صرف فتویٰ ہی نہیں دیا، جب ابتلاءِ آزمائش کی گھڑی آئی مقدمے میں پیش ہوئے، تو اس فتوے پر اصرار کیا اور آزادی کے غاصبوں کے خلاف جنگ کو اس وقت بھی ضروری قرار دیا سے

ضربِ خیال سے کہاں ٹوٹ سکیں گی بیڑیاں،
فکرِ چمن کے ہمرکاب جوشِ جنوں بھی چاہیے

"مولانا فضلِ حق صاحب خیرآبادی کو جو کہ تحریک کے بہت بڑے رُکن تھے، اور بریلی، علی گڑھ اور اس کے ملحقہ اضلاع کے دوران تحریک میں گورنر تھے۔ آخر ان کو گھر سے گرفتار کیا گیا، جس مخبر نے ان کو گرفتار کرایا تھا، اس نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں، فتویٰ جہاد پر جس نے دستخط کیے ہیں وہ یہ فضلِ حق ہیں یا کوئی اور ہیں۔ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ مولانا نے فرمایا، "مخبر نے پہلے جو رپورٹ لکھوائی تھی وہ بالکل صحیح تھی، اور فتویٰ میرا ہے، اب میری شکل و صورت سے مرعوب ہو کر یہ جھوٹ بول رہا ہے" قربان جائیے، علامہ کی شانِ استقلال پر، خدا کا شیر گرج کر کہہ رہا ہے کہ میرا اب بھی یہی فیصلہ ہے کہ انگریز غاصب ہے اور اس کے خلاف جہاد لڑنا فرض ہے۔ منشیٔ بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، وہ جان کی پروا کیے بغیر سربکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں، اور بزدلوں کی طرح منہ پھیر کر جان نہیں بچاتے بلکہ شیروں کی طرح جان دینے کو ...

سمجھتے ہیں۔" ("تحریک ریشمی رومال" از حسین احمد مدنی، ص ۶۵، ۶۴)

اور اب آخر میں یہ بھی دیکھئے کہ جب علامہ پر مقدمہ چلتا ہے، تو کیا ثابت ہوتا ہے۔ فیصلے کا ایک حصہ نذرِ قارئین ہے۔ علامہ فضل حق کے فتوے ہی کی بنیاد پر مقدمہ ان کے خلاف فیصل ہوا اور انہیں کالے پانی کی سزا ہوئی، اس فیصلے کے بعد اب بھی یہ کہنا کہ انہوں نے فتویٰ جہاد پر دستخط نہیں کیے تھے، کیا کہلائے گا؟ ع

تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

"عدالت دو ججوں پر مشتمل تھی، جارج کیمبل جوڈیشل کمشنر، اور میجر بارن قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن، اس مشترکہ عدالت نے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو اپنے فیصلے میں لکھا ... بہرحال عدالت کی نظر میں ثابت ہے کہ اس موقع پر ملزم نے بلا ضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر و مرتد ہیں اور اس لیے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے، بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ تم انہیں قتل نہیں کرتے، تو تم خدا کی نظر میں مجرم ہو۔"

(ماہنامہ "تحریک" دہلی۔ جون ۱۹۶۰ء)

(بحوالہ غالب نام آورم از نادم سیتا پوری ص ۱۸، ۱۷)

جنگِ آزادی

میں

فضلِ حق کا عمومی کردار

در محبت آنچہ می گوئیم، اوّل می کنیم
پارۂ بیش است از گفتار ما، کردار ما

علامہ فضلِ حق رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ جہاد کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ مالک رام اور محمد ایوب قادری کے اس مفروضے کی وضاحت ہو چکی ہے کہ علامہ نے انگریزوں سے جہاد کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔ اب آئیے غلام رسول مہر کی طرف۔ ان کا موقف یہ ہے کہ علامہ فضل حق نے فتویٰ دیا تھا، لیکن صرف فتویٰ ہی دیا تھا، جنگِ آزادی کے کسی مرحلے پر اور کوئی خدمت انجام نہیں دی:

"غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا (فضلِ حق) کے خلاف مقدمے کا باعث بنا ورنہ انہوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔"

("۱۸۵۷ء کے مجاہد" از غلام رسول مہر، ص ۲۰۶)

علامہ فضل حق کے مقابلے میں میاں نذیر حسین دہلوی (اہلحدیث) نے انگریزی حکومت سے دورانِ "غدر" حُسنِ کارکردگی کے تمغے اور نقد انعامات حاصل کیے تھے، مگر غلام رسول مہر ان کی "خدماتِ جلیلہ" کی تعریف میں تر زبان ہوتے ہیں۔ اگر حقائق صفحہ قرطاس پر رقم ہوں کہ ان لوگوں نے "تاریخ نویسی" کی زمین میں کیا کیا گُل کھلائے ہیں، تو لوگ حیرت سے انگشت بدنداں رہ جائیں ؎

عجب کہ حوصلۂ روزگار بر تابد
اگر بروں فگنم آنچہ اندروں من ست

رئیس احمد جعفری اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں "تاریخ" لکھنے والوں نے علامہ کے کارناموں کا اخفا ضروری سمجھا ہے :

"مذکورہ سطور میں ہم نے غدر کے جن ہیروؤں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے صرف بخت خان اور مولانا فضل حق خیر آبادی دو ایسی شخصیتیں ہیں جنہوں نے دہلی کے محاربات غدر میں مرکز نشیں ہو کر حصہ لیا ہے . . . . بخت خان اور مولانا فضل حق کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث، کارناموں اور سرگرمیوں کی تفاصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا . . . . غدر کے بعد غدر کا ذکر بھی کتنا روح فرسا تھا اور ان شخصیتوں کا تذکرہ جنہوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا' اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا . . . . . ان اکابر کا اول تو مرتب اور منضبط صورت میں کہیں ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں۔ ان مشکلات کے باوجود زیادہ سے زیادہ معتبر اور مستند مواد حاصل کرنے کی اپنے مقدور بھر ہم نے کوشش کی ہے۔" ("بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" - ص ۸۳۴) ؎

خونِ دل کو صَرفِ گلشن کر، مگر یہ سوچ کر
تیرے سر الزامِ تحریکِ خزاں بھی آئے گا

جناب حسین احمد مدنی مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ اور ساتھیوں کے جہادِ حریت میں "بڑے پیمانہ پر" حصہ لینے کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے جنگ آزادی میں سرطرح حصہ لیا، کیونکہ وہ اخلاص کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کی غلامی ہماری ملی زندگی کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے، اس کے لیے انہوں نے مقدور بھر اضطراب کا اظہار کیا اور انگریزوں کو زک پہنچانے کے لیے مختلف عملی اقدام کیے ؎

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدمِ ماست
ما زندہ ازانیم کہ آرام نہ گیریم

"بہرحال مسلمان علماء میں سے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب ولاور جنگ مدراسی اور مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی اور مولوی امام بخش صہبائی ۔۔۔۔۔ اور ان حضرات کے تلامیذ وغیرہ نے جہادِ حریت ۱۸۵۷ء میں بڑے پیمانہ پر حصہ لیا تھا۔"

("نقشِ حیات" ص ۴۲۰، از حسین احمد مدنی)

تحریکِ آزادی کی مشہور تاریخ نگار سیدہ انیس فاطمہ بریلوی علامہ فضل حق خیرآبادی کو طبقۂ علماء کا سرگروہ قرار دیتی ہیں :

" خواص میں جنرل بخت خاں، فیروز شاہ، نانا راؤ، نواب تجمل حسین خان، جنرل محمود خاں اور عظیم اللہ خاں تھے اور علماء کے سرگروہ مولوی احمد اللہ، مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیرآبادی قرار پاتے۔"

("۱۸۵۷ء کے ہیرو" ص ۷۰)

پروفیسر محمد ایوب قادری اگرچہ شوشے کی تردید کے خیال سے ان کے آخری مرحلے پر دہلی پہنچنے کے قائل ہیں مگر لکھنؤ میں علامہ کی سرگرمیوں کی زیرِ لب تصدیق کر رہے ہیں :

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنگِ آزادی کے آخری مرحلے میں پہنچے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔"

("جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) از پروفیسر محمد ایوب قادری، ص ۴۳۸)

اسمٰعیل دہلوی ہی کے ایک متبع اہلِ قلم نے اسی حلقے کے ایک جریدے میں انگریزوں کے جاسوسوں کی رپورٹوں اور روزنامچوں وغیرہ کے حوالے سے دہلی کی جنگِ آزادی میں علامہ کے فعال کردار پر روشنی ڈالنے کے بعد منشی ذکاء اللہ دہلوی کی کتاب کا ذکر بھی کیا ہے :

"یہ تو محبِ وطن حضرات کے مخبروں جاسوسوں اور دشمنوں کی رپورٹوں اور روزنامچوں میں اپنے انداز میں مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی دہلی کی جنگِ آزادی

میں جو حصّہ لیا تھا، اس کے بارے میں رائے ہے . . . منشی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "تاریخ عروجِ سلطنتِ انگلشیہ ہند" میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی خدمات کا ذکر کیا ہے، جو انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انجام دی تھیں اور ان کی پاداشس میں ان کو جلاوطن ہونا پڑا۔"

("جامعہ" دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء مضمون امداد صابری، ص ۲۶۸)

اسی صفحہ پر ہی لکھتے ہیں:

"یہ بات تو مسلمہ ہے کہ مولانا فضلِ حق خیر آبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصّہ لیا۔"

جنرل بخت خان مجاہدینِ جنگِ آزادی کے سربراہ تھے لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے حریت کا پرچم اُٹھایا تھا، علامہ فضلِ حق دونوں جگہوں پر ان دونوں کے معتمد تھے اور ان کی کارروائیوں میں شریک رہے۔ کیا اس حقیقت کے منظرِ عام پر آنے کے بعد بھی اس رائے کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ علامہ نے فتویٰ دینے کے علاوہ کسی کام میں حصّہ نہیں لیا۔ اگر یہ باتیں لوگوں کے سامنے لانا جرم ہے، تو میں بھی بہرحال مجرم ہوں ؎

وہ منفعل ہو کہ مشتعل بلا سے مگر
کبھی تو حالِ دلِ زار بر ملا کہیے

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا (فضلِ حق) نے مردانہ وار حصّہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو گرفتار ہوئے۔"

("علم و عمل" وقائع عبدالقادر خانی، جلد اوّل، مترجم مولوی معین الدین افضل گڑھی، ص ۲۵۶)

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصّہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔"

آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا، بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔"

"تذکرہ علمائے ہند" از مولوی رحمان علی۔ ص ۳۸۳)

محمد ایوب قادری صاحب اپنی کتاب میں مولانا فضل حق کے حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہونے کا اعتراف کر چکے ہیں، اپنے ایک مضمون میں انہوں نے جنرل بخت خاں کی مشاورت میں بھی ان کے شریک ہونے کا اعتراف کر لیا ہے۔ پھر وہ علامہ کے قصائد اور ان کی کتاب کو جنگِ آزادی کے نہایت قابل قدر ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اگر علامہ ان حالات کے عینی شاہد نہ ہوتے نہ خود جنگ میں فعال کردار ادا نہ کر رہے ہوتے تو ان کی باتیں قابل قدر ماخذ کیسے قرار پا سکتی تھیں۔

" جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی.... انڈمان ونکوبار کے زمانۂ قیام میں علامہ خیرآبادی سے دو چیزیں یادگار ہیں — "الثورۃ الہندیہ" اور "قصائد فتنۃ الہندیہ"۔ یہ دونوں چیزیں تاریخی ہونے کے علاوہ ادب کا بھی شاہکار ہیں...... یہ رسالہ اور قصیدۂ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے نہایت قابلِ قدر ماخذ ہیں۔"

(مقالہ "جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات"

از محمد ایوب قادری، سہ ماہی "اردو" کراچی جنوری ۶۸ء ص ۶۲)

خلیل احمد نظامی نے ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی کے صفحہ ۹۶، ۹۷ اور ۱۹۲، ۱۹۳ پر بتایا ہے:

" جب زمانہ میں شور وشر پھیلا، تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور (بادشاہ کی) بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے اور نذر اور نثار کیلئے بہت سا روپیہ پیش کیا"

روزنامچے میں ان کی جلالتِ علمی کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"مولوی فضلِ حق نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کیا تھا، یقیناً فنِ منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔"

مولانا فضل حق کی دربارشاہ میں مصروفیت کے بارے میں منشی جیون لال اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے،

"۱۶ اگست ۱۸۵۷ء : مولوی فضلِ حق شریک دربار ہوئے، انہوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۱۸ اگست ۱۸۵۷ء : مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہوجانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا۔

۲ ستمبر ۱۸۵۷ء : مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کررہی ہے۔"

("علمائے ہند کا شاندار ماضی" جلد چہارم ۱۸۵۷ اور جانبازانِ حریت، از محمد میاں - ص ۴۹۴)

مشہور مورخ رئیس احمد جعفری علامہ کی دوسری مصروفیات کے علاوہ والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو جنگِ آزادی میں شامل کرنے کی کوششوں کا ذکر یوں کرتے ہیں: (قارئین کرام اس سے پہلے خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب کا اقتباس ملاحظہ کرچکے ہیں)

"وہ (فضل حق خیرآبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے، چنانچہ غدر جب شروع ہوا، تو مولانا بے تامّل شریک ہوئے۔ وہ بہادر شاہ کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے، ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے، انہیں اہم معاملات و مسائل پر مشورے دیتے تھے اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوجائیں۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ علانیہ حصہ لیا۔ انہوں نے متعدد والیانِ ریاست

اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی، جس جس والیٔ ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات و مراسم تھے۔" ("بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" ص ۸۹۲)

ملاحظہ فرمائیے علامہ فضل حق بہادر شاہ ظفر سے مشورے کرتے ہیں۔ فوجی تنظیم کا جائزہ لیتے ہیں۔ آزادی کے لیے کام کرنے والوں سے مستقل رابطہ رکھتے ہیں اور پھر اس جد و جہد میں سرکار کے مشیر ہیں۔ کیا یہ سب کچھ "کچھ نہ کرنے" کے ضمن میں آتا ہے؟

"دہلی پہنچتے ہی سیدھے قلعے میں گئے اور بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کی، جنگ کی صورتِ حال کے متعلق گفتگو کی، فوجوں کا جائزہ لیا، آزادی حاصل کرنے کے لیے جو لوگ کمر کس چکے تھے، ان سے ملے اور پھر روہیلوں کے سردار جنرل بخت خان کے پاس گئے . . . . ۱۸۵۹ء میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی کو مغلیہ حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے خلاف "بغاوت" میں شریک ہونے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔" ("آزادی کے مجاہد" از محمود الرحمٰن، ص ۳۵)

پروفیسر محمد ایوب قادری کا ایک مضمون "مولانا فضل حق خیر آبادی کو انگریزی لباس اور طرز سے نفرت تھی" روزنامہ "حریت" کراچی میں چھپا ہے، جس میں انہوں نے علامہ فضل حق کے دہلی سے بعد از خرابیٔ بسیار اودھ پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ ایک شخص تحریک کی کامیابی کے لیے ایک ایک آدمی کے پاس جاتا ہے۔ رہنماؤں کا مشیرِ خاص ہے۔ امرائے ریاست کو تحریک میں شامل کرنے کی سعی کرتا ہے، مصائب جھیلتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جد و جہد آزادی میں حصہ لینے کے لیے پہنچتا ہے، یہ سب کچھ جاننے کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی خدمات سے صرفِ نظر کرتا ہے اور اس سلسلے میں ایک واقعہ (فتویٰ جہاد) کو جھٹلاتا ہے، تو بس یہی کہا جاسکتا ہے ؎

اُن کو الزام اگر دیں بھی، تو ہم کیوں کر دیں
اتنے معصوم ہیں، انجان نظر آتے ہیں

"۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مولانا فضل حق الور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے

بعداز خرابیٔ بسیار اودھ پہنچے ۔ حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوتے ۔ بعدازاں مولانا فضل حق گرفتار ہوئے ۔ بغاوت کے جرم میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا ۔" (روزنامہ "حریت" کراچی ، ۹ جولائی ۱۹۷۷ء)

جرم بغاوت کے اس مجرم کو صرف اسماعیل دہلوی کے عقائد پر گرفت اور ان کی تغلیط پر اتنی کڑی سزا نہیں دینی چاہیے کہ یا تو ان کا ذکر جنگِ آزادی کے تذکرے میں سرے سے کیا ہی نہ جائے ۔ اگر ذکر ناگزیر ہو تو کبھی کہا جائے کہ انہوں نے فتویٰ نہیں دیا ، کبھی قرار دیا جائے کہ فتویٰ تو خیر انہوں نے دیا تھا اور کچھ نہیں کیا ۔

حامد حسن قادری ان کے "جرمِ بغاوت" کے متعلق اشارہ کرتے ہیں :

"۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرمِ بغاوت عائد کیا گیا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم ہوا ۔"

("داستانِ تاریخ اُردو" از حامد حسن قادری ، ص ۳۲۹)

مولوی ذکاء اللہ دہلوی بھی علامہ فضل حق کو علمائے حق کا سرخیل گردانتے ہیں (بحوالہ "خون کے آنسو" حصہ اوّل ، از مشتاق احمد نظامی ص ۴۴)

علامہ پر قائم کردہ مقدمے کی رپورٹ میں لکھا ہے :

"یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں ۔ باغی فوج میں ان کی "اربعہ شوریٰ" کے نام سے شہرت تھی ، بلکہ کبھی کبھی انہیں "کچہری پارلیمنٹ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا ۔ اس شوریٰ میں ملزم (فضل حق) بہت ممتاز تھا ۔"

فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے :

"وہ خطرناک ترین آدمی ہے ، جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے انصاف اور امنِ عامہ کا تقاضا ہے کہ ایسے لوگ بدر کر دیا جاتے ہے ۔"

جوڈیشنل کمشنر اودھ اور قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن نے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا:

"بغاوت شروع ہونے کے وقت، وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے دیدہ دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیئے اور اسے خاص طور سے ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔" (ماہنامہ "تحریک" دہلی، جون ۱۹۶۰ء)

(بحوالہ حرفِ آغاز "باغی ہندوستان" از محمد عبدالحکیم شرف قادری)

(مطبوعہ، مکتبہ قادریہ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور)

سید مصطفٰے علی بریلوی جنگِ آزادی کے عظیم رہنماؤں کی فہرست میں مولانا فضل حق کا ذکر یوں کرتے ہیں:

ہماری پہلی جنگِ آزادی کے ہیرو بلاشبہ انگریزی فوجی اور سول افسران سے کسی طرح قابلیت اور حب الوطنی میں کم نہیں تھے جنرل بخت خان، جنرل محمود خان، بیگم حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، سید لیاقت علی، مولانا فضل حق، خان بہادر خان، نانا راؤ، تانتیا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، جھانسی کی رانی، محمد علی خان عرف جمی گرین وغیرہ مجاہدین کے لیڈر تھے اور اپنی اپنی جگہ بڑی بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔"

(مضمون "جنگِ آزادی کی کہانی، انگریزوں کی زبانی)

(ماہنامہ "ترجمان اہلسنت" کراچی۔ جنگِ آزادی نمبر، ص ۱۰۵)

دہلی کے اس دور کا ایک اخبار نویس منشی لال ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو یہ خبر دیتا ہے،

"علماء نے دین سے تمام شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے انگریزوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی اور ان کو کفار کو قتل کرنے سے اجرِ عظیم ملتا ہے ہزاروں مسلمان ان کے علم کے نیچے جمع ہو گئے۔" (بہادر شاہ کا مقدمہ ۔ ص ۱۱۷)

اس قسم کے متعدد جلسے ان علماء نے مسجدوں خصوصاً جامع مسجد میں کیے اور ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی اپنی پُرجوش تقریروں سے مسلمانوں میں جوش جہاد پیدا کرتے رہے، چنانچہ یہی جیون لال لکھتا ہے:

"مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔"

(اخبار دہلی، از جیون لال، ص ۲۷۳، فائل ۱۲۷)

(بحوالہ فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون" از حکیم محمود احمد برکاتی۔ ص ۴۸)

اودھ کے چیف کمشنر کا سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے سیکرٹری کے نام ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ایک سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

"مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیام امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکھنؤ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمن جاں ہے، حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے۔"

(بحوالہ فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون۔ ص ۸۸، ۸۷)

بہادر شاہ ظفر سے علامہ فضل حق کی ملاقاتوں کا مقصد جنگ آزادی کو تیز تر کرنا تھا، انہوں نے بادشاہ کو فعّال کرنے کی کوشش کی، مجاہدین کی سرپرستی کی اہمیت جتائی اور دوسرے مناسب مشورے دیتے:

"... ان حالات میں تحریک کی کامیابی کے امکانات کا دھندلا جانا لازمی ہے۔ مولانا نے اس اہم مسئلے پر پہلے دن سے توجہ دی اور بہادر شاہ سے اپنی پہلی ملاقات میں اس پر زور دیا کہ مجاہدین کی روپیہ اور سامانِ رسد سے مدد کرنا نہایت ضروری ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب جب بھی بادشاہ سے ملتے، بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی

کریں اور ان کے ساتھ باہر (محاذ پر) نکلیں اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو، بہتر معاوضہ دیں۔" (میموائرس - ص ۲۴، ۲۳)

(بحوالہ فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، ص ۵۰،۴۹)

علامہ فضل حق نے صرف بہادر شاہ اور بخت خان سے ملنے اور انہیں مشورہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ شاہ نے "جنگ کونسل" تشکیل دی تھی۔ علامہ اس کے بھی بڑے اہم رکن تھے۔

"سید مبارک شاہ (جو دوران غدر دہلی کا کوتوال رہا تھا) کا بیان ہے کہ شاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی تھی۔ مبارک شاہ ہی نے ایک جگہ اس کو بریوی کونسل بھی لکھا ہے۔"

THE GREAT REROFUTION OF 1857

(از ڈاکٹر سید معین الحق - ص ۱۲۸، ۱۸۳)

سوویٹ یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارۂ علوم شرقیہ کی ایک ممتاز رکن مادام پولونسکایا ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

"مولانا (فضل حق) الور تشریف لائے، جہاں انہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمیندار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں، اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔ مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انہوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے۔ . . . . . مولانا فضل حق خیرآبادی کے سماجی اور سیاسی نظریات سامراجی محکومی کے جوئے سے ملک کو آزاد کرنے کی اس خواہش کے آئینہ دار تھے جو پوری قوم کے سینے میں پروان چڑھ رہی تھی۔

اس حیثیت سے ان کی جملہ سرگرمیاں ہندوستان کے قومی مفاد کو پورا کرتی تھیں۔" (پندرہ روزہ "سوویت دیس" دہلی، ۱۰/ جولائی ۱۹۵۸ء)

(بحوالہ غالب نام آورم - ص ۱۱۶)

ے بجو د خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ صبا تند و شعلہ بیباک است

ڈاکٹر مہدی حسین لکھتے ہیں:

"اگر جیون لال کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، تو مولوی فضل حق نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے۔"

("بہادر شاہ" دوم - ص ۳۹۱)

بحوالہ فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون۔ ص ۵۲، ۵۱)

ے آغشتہ ایم ہر سر خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

○

جنگِ آزادی
کے
مخالف کون؟

کہیں گرتی ہوئی دیواریں، کہیں جھکتی چھتیں
آپ کہتے ہیں، تو یہ قصرِ وفا ہی ہوگا

جن لوگوں نے دوسروں کا کیا دھرا اپنے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش میں قلم سے گھاس کھدائی شروع کر رکھی ہے۔ تاریخ سے پوچھیں کہ ہر ایسے موقع پر جب دین و ملت کے لیے کوئی فیصلہ کن مرحلہ سامنے آیا، ان کا کردار کیا رہا ہے؟ تو حیرت انگیز انکشافات سامنے آتے ہیں:

یہ درست ہے کہ ان "بڑوں" کے چھوٹے اب خود "تاریخ ساز" ہیں، اور اس معاملے میں خود کفیل ہوتے جا رہے ہیں، انہیں اب اپنے خول سے باہر جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، مگر اس طرح آنکھیں بند کر لینے سے خطرات ٹل تو نہیں جایا کرتے۔ اپنی ذات میں گم رہنے کی اس نئی تاویل سے حقائق کا شیر تو اندھا نہیں ہو جاتا۔ واقعات کو کریدیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد صاحبان انگریز کے ایماء پر سکھوں اور مسلمانوں سے "جہاد" کرتے رہے اور ان کے ساتھیوں نے زیادہ تر جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریز کے خلاف جہادِ حریت میں حصہ لینے والے وہی علماء تھے جو اسماعیل دہلوی کے مخالف تھے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت جن کے عقیدے اور ایمان کی بنیاد تھی۔ ہم ان حقائق کے رُخ سے نقاب ہی نہ اٹھا سکیں، تو ہماری کم ہمتی ہے، ورنہ سچائیاں چھپنے کے لیے نہیں ہوتیں ؎

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں پورے جوش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے وہ سب کے سب علماء کرام شامل تھے، جو عقیدۃً حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل کے شدید ترین دشمن تھے اور جنہوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور اپنے شاگردوں کو لکھنے کی وصیت کی ہے۔" (حاشیہ مقالاتِ سرسید۔ حصہ شانزدہم)

(از محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۳۵۲)

اس حقیقت کا اعتراف خود اہل حدیث حضرات کے ایک عظیم رہنما نواب صدیق حسن خاں نے اپنی تصنیف "ترجمانِ وہابیہ" میں یوں کیا ہے:

"زمانہ غدر میں سواروں اور تلنگوں نے بعض مولویوں سے زبردستی جہاد کے مسئلہ پر مہر کرائی۔ فتویٰ لکھا جس نے انکار کر دیا اس کو مار ڈالا اور اس کا گھر لوٹ لیا۔ سو وہ مہر کرنے والے اور فتوے لکھنے والے بھی غالباً وہی لوگ تھے جو اہل سنت و اہل حدیث کو زبردستی "وہابی" نام رکھتے ہیں۔"

("ترجمانِ وہابیہ" از نواب صدیق حسن خاں، ص ۵۵)

اہل حدیث حضرات کے ایک بہت بڑے عالم و فاضل مولوی محمد حسین بٹالوی اپنی کتاب "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" میں کہتے ہیں کہ جن مسلمانوں نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا، وہ قرآن و حدیث کی رو سے مفسد، باغی، اور بدکردار تھے۔ ان میں سے جو علماء کہلاتے تھے، وہ بھی قرآن و حدیث سے بے بہرہ، نافہم اور بے سمجھ تھے۔

ان وہابیوں کے نزدیک قرآن و حدیث کی تعلیمات کا ماحصل یہ ہے کہ انگریزوں کی کاسہ لیسی کرو، ان کے ایجنٹ کرنے پر ان کے مخالفوں سے جنگ کرو، ان سے مصروفِ جہاد لوگوں کے خلاف فتوے دو۔ انگریزوں کے ہم زبان ہو کر مجاہدین کو مفسد، باغی اور بدکردار قرار دو اور حکومتِ انگلشیہ کے ساتھیوں کو "مجاہدین" قرار دو:

"مفسدہ ۱۸۵۷ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے، وہ سخت گنہگار اور بحکم قرآن و حدیث وہ مفسد باغی اور بدکردار تھے۔ اکثر ان میں عوام کالانعام تھے۔ بعض جو خواص و علماء کہلاتے تھے وہ بھی اصل دین (قرآن و حدیث) سے بے بہرہ تھے یا نافہم و بے سمجھ، باخبر اور سمجھدار علماء اس میں ہرگز شریک نہیں ہوتے۔" (الاقتصاد فی مسائل الجہاد۔ ص ۴۹)

محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کا اعتراف ملاحظہ کیجئے کہ وہابی تحریک جس کا مرکز صادق پور تھا، تحریک آزادی کی مخالف تھی۔

"دوسری تنظیم جو اس تحریک کے زمانے میں موجود تھی، وہ تنظیم ہے جس کو وہابی تحریک کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے جس کا مرکز صادق پور تھا، تنظیم بحیثیت تنظیم تحریک سے الگ رہی، بلکہ اگر مولانا عبدالرحیم صاحب مصنف "الدر المنثور" کا قول صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو یہ تنظیم ۱۸۵۷ء کی تحریک کی مخالف رہی۔"

(علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد چہارم ص ۲۱۳)

دیوبندی حضرات اسماعیل دہلوی کے مخالفوں کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کی خوشامد میں کیا زبان استعمال کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

"بعض کے سروں پر موت کھیل رہی تھی، انہوں نے کمپنی (انگریزی حکومت) کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے علم بغاوت کا علم قائم کیا۔"

(تذکرۃ الرشید حصہ اول، از عاشق الٰہی میرٹھی، ص ۷۳)

مشاہدے کو تو کانٹوں کی بھیک بھی نہ ملی
سنا ہے صحن گلستاں میں پھول کھلتے ہیں

انگریزوں

کا

ایک حاشیہ بردار

واقف نہیں تو اس کے لبوں کو کنول نہ لکھ
الفاظ کو خضاب لگا کر غزل نہ لکھ

اسماعیل دہلوی نے جس قسم کی "مجددیت" کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ اشارات کرچکا ہوں۔ مفصل ذکر آگے آئے گا۔ اس "مجددیت" کی تکمیل کرنے والے ان کے جانشین سید نذیر حسین دہلوی تھے۔

"مولانا شہید (اسماعیل دہلوی) نے مجددیت کی بنیاد ڈال دی تھی مگر بسبب اس کے کہ آپ کی عمر صرف ترپن[۵۳] برس کی ہوئی اور ایک معتد بہ زمانہ آپ کا جہاد میں صرف ہوا۔ علمِ الٰہی میں اس کی ضرورت تھی کہ اس تجدید کو کامل کرنے کے لیے ایک خاتم بھی آگے سے موجود رہے ..... اس جانشین سے مراد ہیں مولانا سید نذیر حسین"

("الحیات بعد الممات" سوانح عمری میاں سید نذیر حسین ص ۲۰۷)

"مجدد" بھی انگریزوں کی وفاداری پر مفتخر تھے، مجددیت کی تکمیل کرنے والے ان جانشین کے متعلق ان کے اپنے محمد جعفر تھانیسری کے الفاظ سنیے:

"مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی جو ایک نامی خیر خواہ دولتِ انگلشیہ کے ہیں۔" ("کالا پانی" ص ۲۴)

انگریزوں کے ان نامی خیر خواہ کو جنگِ آزادی میں حصہ دلانے کی کوششوں کا ایک ہیولیٰ ملاحظہ فرمائیے:

"مولوی میاں نذیر حسین بن جواد علی ۔۔۔۔ نے ایک طرف تو جہاد کے فتوے پر دستخط کیے اور دوسری طرف انہوں نے ایک انگریز عورت مسز لیسنس کو پناہ دی۔" (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، از محمد ایوب قادری، ص ۴۰۹)

اصل میں ہمارے ان دوستوں کی سمجھ میں سرے سے یہ بات آتی ہی نہیں کہ کوئی شخص علامہ فضل حق خیر آبادی کی استقامت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے، چونکہ اس جنگ میں "وہابیوں" کا کردار اجتماعی قومی اور ملی مفاد کے خلاف تھا، اس لیے وہ جنگ آزادی کے ہیروؤں کے خلاف توزبان کھولنے کے کئی ڈھنگ نکالتے ہیں اور اپنوں کی عظمت کے اظہار کے لیے کئی جھوٹ لے ٹیں تعجب ہے کہ میاں نذیر حسین تو جہاد کے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

(الحیاۃ بعد المات، ص ۱۲۵)

اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب فتوے پر ان کے دستخط ثابت کرتے ہیں، اس کے برعکس علامہ فضل حق فتویٰ دیتے ہیں۔ عدالت میں فتویٰ پر اصرار کرتے ہیں اور پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے فتویٰ دیا ہی نہیں۔ انہوں نے انگریز عورت کو پناہ دینے کی بات بھی اس انداز سے کہی ہے جیسے انسانی ہمدردی کے جذبے سے ایسا کیا گیا ہو، حالانکہ نذیر حسین صاحب نے انگریزوں کی خوشنودی کے لیے ایسا کیا تھا جس کے نتیجے میں انہیں سندیں اور نقد انعامات ملے۔ لیکن پروفیسر ایوب قادری صاحب ہی کی بات کیا کیجئے۔ غلام رسول مہر تو ان سے بھی کئی قدم آگے نکل گئے ہیں اور غلط بیانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میاں صاحب (سید نذیر حسین دہلوی) نے اس کا صلہ کچھ نہیں لیا تھا، محض اسلامی فرض سمجھ کر انگریز خاتون کو پناہ دی تھی۔

"یہ صحیح ہے کہ میاں نذیر حسین مرحوم نے ایک انگریز عورت کو جو بے بس پڑی تھی، اٹھا کر اپنے ہاں علاج کیا تھا، وہ تندرست ہو گئی اور اسے اس کی خواہش کے مطابق دہلی کا محاصرہ کرنے والی انگریزی فوج کے کیمپ میں بھی پہنچا دیا گیا، مگر اس کا صلہ کچھ نہیں لیا تھا اور کہا تھا کہ یہ میرا اسلامی فرض تھا۔"

اب ذرا حقائق کی طرف بھی جھانک لیجئے اور یہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا، ان لوگوں کی اپنی کتابوں سے کہوں گا۔

سید نذیر حسین دہلوی کی سوانح عمری "الحیاۃ بعد المماۃ" مطبوعہ مکتبہ شعیب، حدیث منزل کراچی میں ہے:

"تین مہینوں کے بعد جب پوری طرح امن قائم ہو چکا، تب اس نیم جان میم کو جو بالکل تندرست اور توانا تھی، انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا، جس کے صلے میں مبلغ ایک ہزار تین سو روپے اور مندرجہ ذیل سارٹیفکیٹیں ملیں۔"

("الحیاۃ بعد المماۃ" از فضل حسین بہاری، ص ۱۲۷)

فضل حسین بہاری کے علاوہ خود پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی "حیات سید احمد شہید" میں تسلیم کیا ہے کہ مجددیت اسماعیل کے اس تکمیل کنندہ نے سفر و حضر میں انگریزوں کی سندوں کو حرز جاں بنائے رکھا۔

"میاں نذیر حسین وفادار گورنمنٹ ٹھہرے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ جب میاں صاحب حج کو تشریف لے گئے، تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے۔ گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۱۴ جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔"

("الحیات بعد المماۃ" ص ۸۱، ۱۰۰)

(تذکرہ رجال از محمد ایوب قادری، تتمہ "حیات سید احمد شہید" مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ص ۳۸۴)

مولوی نذیر حسین صاحب کو وفاداری کے جو سرٹیفکیٹ عنایت ہوئے ان میں سے ایک کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بہت بڑے مقتدر عالم ہیں جنہوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے... جس کسی برٹش گورنمنٹ افسر کی وہ مدد چاہیں گے، وہ ان کو مدد دے گا۔

کیونکہ وہ کامل طور سے اس مدد کے مستحق ہیں۔"

دستخط جے ڈی ٹریملٹ بنگال سروس

(کمشنر دہلی و سپرنٹنڈنٹ - ۱۰ اگست ۱۸۸۳ء)

("الحیاۃ بعد المماۃ" ص ۱۴۰)

سنبھل کر پاؤں رکھنا میکدے میں شیخ جی صاحب
یہاں پگڑی اچھلتی ہے، اسے میخانہ کہتے ہیں

جب علامہ فضل حق اور دوسرے علماء حق انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے "وہابی" انگریز سرکار کی مدح سرائی میں رطب اللسان تھے۔ "الحیاۃ بعد المماۃ" میں ابتہاج و افتخار کے ساتھ مولوی نذیر حسین المعروف "میاں صاحب" کی انگریزوں کی کاسہ لیسی کا ذکر کیا گیا ہے:

"یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میاں صاحب بھی (زور لفظ بھی پر ہے) گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں جبکہ دہلی کے بعض متقدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے نہ اس پر دستخط کیے نہ مہر۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میاں! وہ ہلڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی، وہ بیچارہ بڈھا بادشاہ کیا کرتا۔ حشرات الارض خانہ برانداز وں نے تمام دہلی کو خراب، ویران تباہ اور برباد کر دیا۔ یہ شرائط امارات و جہاد بالکل مفقود تھے، ہم نے تو اس فتویٰ پر دستخط نہیں کیا مہر کیا کرتے۔" ("الحیاۃ بعد المماۃ" مطبوعہ مکتبہ شعیب کراچی ص ۱۲۵)

• سچی بات تو یہ ہے کہ آپ باتوں اور تحریروں سے جیسے گل بوٹے سجالیں جب تک کردار نہ ہو سب باتیں نقش بر آب اور صدا بصحرا ثابت ہوں گی ؎

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

○

اسماعیل دہلوی کا سیاسی کردار

انگریزوں

کے ساتھ تعلقات

مجھے انکارِ وصلِ غیر پر کیوں کر نہ شک گزرے
زباں کچھ اور، بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

آجکل کچھ لوگوں نے بالالتزام یہ کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے کہ سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی کی "تحریکِ مجاہدین" کا اصل مقصد انگریزوں کی مخالفت تھا اور وہ ہماری "جنگِ آزادی" کے ممتاز ہیرو ہیں ؎

کیونکر حقیقتوں کا پتہ چل سکے کہ لوگ
ملتے ہیں اپنے آپ سے بھی اوڑھ کر نقاب

اس باب میں اس دعوے کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے :

"اس زمانہ میں بعض حضرات یہ کہنے لگے ہیں کہ دراصل سید احمد شہید کا مقصد انگریزوں سے جہاد کرنا تھا، سکھ تو ویسے ہی درمیان میں آگئے۔" یا "اگر سکھ آزادیٔ وطن کے جہاد میں حضرت سید احمد شہید کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے، تو خود ان سے رزم و پیکار کی کوئی وجہ نہ ہوتی" یا "سکھوں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت شہید کا پختہ ارادہ انگریزوں سے جہاد کا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان تینوں بیانات کا کوئی حقیقی ثبوت موجود نہیں اور صاف اور سچی بات یہی ہے کہ ہرگز ہرگز حضرت کا ارادہ انگریزوں سے جہاد کا نہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سرسید (جو حضرت شہید کے سب سے قریب العہد مورخ ہیں، ضرور اس کا ذکر کرتے۔"

(حاشیہ "مقالاتِ سرسید" حصہ شانزدہم از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔ ص ۲۴۸)

سرسید احمد خاں کا مضمون ڈاکٹر ہنٹر کی غلط فہمیوں کا ازالہ "مقالاتِ سرسید" حصہ نہم کے صفحہ ۲۵ تا ۲۰۶ پر پھیلا ہوا ہے جس میں انہوں نے دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی کی "تحریک" کا انگریزی حکومت کی مخالفت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، بلکہ یہ لوگ انگریز کے ایماء پر سکھوں سے لڑنے کے لیے نکلے تھے مضمون کے آخر میں "مقالاتِ سرسید" کے مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے :

"سرسید نے اس مضمون میں یہ بات بار بار لکھی ہے کہ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید انگریزی حکومت کے ہرگز ہرگز مخالف نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ سرسید کے اس بیان کی تائید متعدد مورخین نے بھی کی ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خاں نے "ترجمانِ وہابیہ" مطبوعہ امرتسر کے صفحہ ۲۱ اور ۸۸ پر نیز "سوانح احمدی" مؤلفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری میں بیس مقامات پر اسی طرح حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی سوانح موسوم بہ "حیاتِ طیبہ" کے صفحات ۱۵۹، ۲۹۲، ۲۹۴ پر بھی اسی خیال کو پیش کیا گیا ہے۔"

("مقالاتِ سرسید" حصہ نہم، ص ۲۰۷)

خود ان لوگوں کے رسالہ "الفرقان" نے اسماعیل صاحب پر ایک خاص نمبر شائع کیا تو اس میں بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہی بنی :

"مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا، اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔"

("الفرقان" شہید نمبر ۱۳۵۵ھ، ص ۷۶)

تو شبانہ می نمائی بہ برکہ بودی امشب !
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

سرسید احمد خاں اس تحریک اور آزادی کی تحریک کے زمانے کے آدمی تھے، وہ لکھتے ہیں کہ اسماعیل دہلوی صاحب نے اثنائے وعظ میں انگریزوں کے خلاف کے ایک استفتا کے جواب میں فرمایا کہ "ان کے مذہب کی رو سے یہ بات ان پر فرض ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف کبھی جہاد میں شریک نہ ہوں۔ یہ کوئی خاص مذہب معلوم ہوتا ہے۔ دین برحق نے تو اس قسم کی کوئی قدغن نہیں لگائی۔"

"اثنائے وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے۔ وہ بھی تو کافر ہیں، اس کے جواب میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ "انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں، اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں"۔ پس اس زمانہ میں ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے ہندوستان میں جمع ہوگیا۔"

("مقالات سرسید"، حصہ نہم از سرسید احمد خاں ص ۱۴۲)

اس کے بعد سرسید نے کمشنر اور مجسٹریٹ کی اطلاع پر گورنمنٹ کا فیصلہ بتایا ہے کہ "ان سے تعرض نہ کیا جائے، کیونکہ ان کا ارادہ کچھ گورنمنٹ انگریزی کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے۔"

آجکل کے تاریخ ساز سرسید پر معترض ہوتے ہیں کہ وہ انگریز سے مسلمانوں کے تعلقات بحال کرنے کے آرزومند تھے، اس لیے اس قسم کی باتیں کہتے ہے، ورنہ تحریک مجاہدین تھی تو انگریزوں کے ہی خلاف، لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سید احمد اور اسماعیل صاحبان کے سب سے پہلے مداح اور ساتھی جعفر تھانیسری صاحب بھی اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں ؎

طاقت بر خواستن از گرد غم کم نماند
خلق پندارد کہ میخوار است و مست افتادہ است

"یہ بھی صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیام کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسمٰعیل شہید وعظ فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکارِ انگریزی پر جہاد کرنا درست ہے یا نہیں ؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ۔"

(سوانح احمدی" مطبوعہ فاروقی دہلی، ص ۷۳)

انہی محمد جعفر تھانیسری صاحب کے حوالے سے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں :

"مولوی محمد جعفر تھانیسری جنہیں وہابیوں کے مقدمۂ سازش میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی۔ اپنی کتاب "سوانح احمدی" میں لکھتے ہیں، جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے کسی شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہو، انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں، وہ دین اسلام کے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملکِ ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا . . . . سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے، نہ انگریزوں کا، نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے . . . سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے، مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادتِ لازمی سے روکتی ہے۔" (موج کوثر، ص ۲۰)

چونکہ تھانیسری صاحب کی کتاب میں بیسیوں مقامات پر اس قسم کی کئی سچی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہیں اور اس وقت وہ انگریز کی وفاداری کو فخر و مباہات سمجھتے تھے، اس لیے آج کے "محققین" ان پر بھی دروغ گوئی کا الزام لگانے سے نہیں چوکتے۔ اس قسم کے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر قارئین میں سے کئی حضرات شاید جعفر صاحب کو کوئی عام مصنف سمجھتے ہوں، ان کی اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی خاطر تحریکِ مجاہدین کے نام لیواؤں کی تحریروں میں سے جعفر صاحب اور ان کی کتاب

"سوانح احمدی" کی حیثیت کے بارے میں چند آراء ملاحظہ ہوں:

• "سوانح احمدی"، مطبوعہ صوفی کمپنی کے متعلق جناب مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں،

"اس میں حضرت سید صاحب کے حالاتِ زندگی جہاد اور تعلیمات کا خلاصہ درج ہے۔ یہ اُردو زبان میں سید شہید کی سب سے پہلی مرتب سیرت ہے۔ تاریخی نام تواریخِ عجیبہ ہے۔"

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ ص ۲۷)

اسی کتاب کے صفحہ ۱۷ پر لکھا ہے کہ "مصنف سید صاحب کی جماعت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔"

"سوانح احمدی" کے بارے میں غلام رسول مہر خود یہ لکھنے پر مجبور ہیں،

"اُردو زبان میں سید صاحب کے متعلق یہ پہلی کتاب ہے۔"

("سید احمد شہید" از غلام رسول مہر، ص ۲۲)

چند اور آراء ملاحظہ ہوں،

"سوانح احمدی" اور تواریخ عجیبہ اُردو کی پہلی کتاب سید صاحب کے حالات میں مقبول و مشہور ہے، جس سے سید صاحب کے حالات کی بہت اشاعت ہوئی۔"

("سیرت سید احمد شہید" از ابوالحسن علی ندوی، ص ۸)

"مولوی محمد جعفر تھانیسری حضرت سید صاحب کے مستند سوانح نگار ہیں۔"

("نقشِ حیات" از حسین احمد مدنی، ص ۱۸ ۴)

"مولوی محمد جعفر تھانیسری سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے خاص رکن اور بڑے رازدار تھے۔"

(مضمون "جزائر انڈمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات"
(از پروفیسر محمد ایوب قادری، سہ ماہی اُردو کراچی، ص ۸۷)

"مولوی محمد جعفر تھانیسری تحریکِ جہاد و اصلاح کے ایک نامور شخص تھے"
(مضمون "پروفیسر محمد ایوب قادری اور اہلِ حدیث" از سید نذیر احمد)
(ہفت روزہ "الاسلام" لاہور، ۵ اگست ۱۹۷۷ء)

تھانیسری صاحب کے وہابی ہونے کے ناطے اُن کے سامنے ہر گردن کو جھکانا ضروری سمجھا جاتا ہے، لیکن انگریزوں کی کاسہ لیسی کے متعلق تحریکِ مجاہدین کے بڑوں کے اقتباسات تھانیسری صاحب کے قلم سے حُسن کرسرِ تسلیم جھکانے میں تعرض ہے۔

"مولوی جعفر تھانیسری سید صاحب کے خاص معتقدین سے وابستہ تھے، اس وابستگی کے باعث انہوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار لٹایا اور کم و بیش اٹھارہ سال کالے پانیوں میں بسر کیے۔ ان کی قربانیوں کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جانی چاہیئے" (سید احمد شہید" از غلام رسول مہر، ص ۲۵۸)

"یہ کتاب "حیاتِ سید احمد شہید" حضرت سید احمد شہید کے مخلص متبع جعفر تھانیسری کی تصنیف ہے۔۔۔۔۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس کتاب کی اہمیت کیا ہے، ہر ہر لفظ سے مجاہد کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔"
(پیش لفظ "حیاتِ سید احمد شہید" از محمد اقبال سلیم گاہندری،
(مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔ ص ۴)

"سوانح احمدی" سید صاحب کے حالات میں سب سے پہلی کتاب ہے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اور اس موضوع پر دوسری کتابوں کے لیے بنیادی مواد ثابت ہوئی۔۔۔۔ اس میں ان کی سپاہیانہ زندگی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا بیان ہے اور تمام معرکوں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو سکھوں وغیرہ سے پیش آئے تھے"
(مقدمہ "حیاتِ سید احمد شہید" از محمد ایوب قادری ص ۴۴)

یہاں "وغیرہ" سے پروفیسر صاحب کی مراد سرحد کے اہلِ اسلام ہیں، لیکن لفظ کے ارتکام

یہیں ابہام کاالتزام یوں روا رکھا ہے کہ لوگ اس سے انگریز بھی مراد لینا چاہیں تو کوئی حرج نہ ہو۔
ہاں تو جعفر صاحب اپنی کتاب کے مندرجات کے درست ہونے کے متعلق تو دکیا کہتے ہیں، یہ بھی دیکھنا چاہیے۔

"میں نے اس کتاب (سوانح احمدی، تواریخ عجیبہ) کو بڑے راست باز لوگوں کی متعدد تحریروں سے نقل کیا ہے، جنہوں نے ان واقعات کو خود دیکھا میرے نزدیک اس کتاب کی روایت میں دروغ گوئی یا مبالغہ کو کچھ دخل نہیں۔"

(سوانح احمدی، مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری۔ ص ۳)
(مطبوعہ صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی، منڈی بہاؤ الدین)

"جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب "سوانح احمدی" کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ سید صاحب کے حالات میں بیس سے زیادہ بدلائل شرعی اعلانات ہیں کہ سرکار کی مخالفت کوئی نہ کرے۔ اور مہر صاحب نے اپنی کتاب "سید احمد شہید" کے ۲۴ ویں باب میں جامع الشرائط امام کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے کہ جہاد میں کفار و فساق سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ غیر مسلم دشمن کے مقابلے میں غیر مسلم معاہد کو رفیق بنایا۔" (سید احمد شہید کی صحیح تصویر، از وحید احمد مسعود، ص ۱۵۳)

جعفر صاحب نے وہابیت کے جوش میں سید صاحب اور اسماعیل صاحب کو بہت بڑا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے حتیٰ کہ مشہور مؤرخ رئیس احمد جعفری کو ان کی "جانب داری" پر کہنا پڑا۔

"کتاب (تاریخ عجیب۔ کالا پانی) بڑی دلچسپ ہے اور بڑے لرزہ خیز احوال و حوادث پر مشتمل ہے، لیکن اس میں ایک بڑی کمی بھی ہے۔ مولانا نے سب کچھ لکھا ہے لیکن رفقائے زنداں کے ذکر سے بالکل گریز کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
حق بات یہ ہے کہ مولانا پر "انا" اور تحریک وہابیت کا جوش اس قدر نمایاں غالب

تھا کہ وہ اپنے اور اپنی تحریک کے سوا کسی اور چیز کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے
اگر انہوں نے کالے پانی کے دوسرے بلند مرتبت اور اعلیٰ مقام اسیروں کا ذکر کیا
ہوتا، تو اس کتاب کی افادیت اور اہمیت بہت زیادہ ہوتی۔"

(بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد، صفحہ آخر)

وہابیت کے اس جوش میں انہوں نے جس قدر اخفاء کیا ہے، اجتنا اپنے ممدوحین کو بڑھا چڑھا کر
بیان کیا ہے، اس سے قطع نظر "سوانح احمدی" اور "مکتوبات سید احمد شہید" میں جس قدر سچی باتیں اُن کی زبان
قلم سے نکلی ہیں انہیں بھی ان کے اخلاف برداشت نہیں کر سکتے اور اب جعفر صاحب کی یہ حالت ہے کہ ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم!
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

سچ بولنے میں کنجوسی سے کام لے کر وہ تاریخ کے گناہ گار ہوئے اور ایک آدھ سچا فقرہ یا پیرا لکھ کر اپنے
پیروؤں کی دشنام طرازی کا ہدف بنے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَار۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ انگریزوں کے خلاف جہاد نہ کرنے کے شاہ اسمٰعیل کے فتوے
کے اندراج پر سر سید احمد خاں اور جعفر تھانیسری تو اپنی قوم کے معتوب ہوئے تھے، لیکن اس کو کیا
کیا جائے کہ اسماعیل دہلوی کو "پیارے شہید" اور علامہ فضل حق کو "مولوی منطقی" لکھنے والا مرزا حیرت
دہلوی بھی اس واقعے کی تصدیق کرتا ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں کہ انگریز کے دشمن کو "پیارے شہید"
نے اپنا دشمن قرار دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آج کے "دانشور" اس حرکت پر مرزا حیرت دہلوی کو
"جھوٹوں کا بادشاہ" قرار دیتے ہیں ؎

جو تیرے رازداں تھے، بڑے معتبر ملے
کچھ نیم آشنا ملے، کچھ بے خبر ملے

"کلکتہ میں جب مولانا اسماعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے
اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے، تو ایک شخص نے دریافت کیا آپ

انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے ؟ آپ نے جواب دیا ان پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں، ایک تو ان کی رعیت ہیں۔ دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح کی آزادی ہے، بلکہ ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں" (حیاتِ طیبہ، از مرزا حیرت دہلوی ص ۲۹۶ مطبوعہ فاروقی دہلی)

یاد رہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو پہلے ان لوگوں نے مستند اور مضبوط کتاب قرار دیا تھا۔

"دوسری کتاب مرزا حیرت مرحوم کی "حیاتِ طیبہ" ہے جو شاہ اسماعیل کی نہایت مبسوط سوانح عمری ہے۔" (الفرقان، شہید نمبر ۱۳۵۵ھ ص ۵۱)

جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی نے اپنے ممدوحین کو بنانے سنوارنے میں اپنی عاقبت خراب کر لی، بہت کچھ کیا ؎

کیا کچھ کیا نہ خود کو چھپانے کے واسطے
عریانیوں کو اوڑھ لیا شال کی طرح

لیکن انگریزوں سے سید اسماعیل کی وفاداری کہیں نہ کہیں ان دونوں کے قلم سے جھلک ہی پڑی سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کہتے ہیں کہ انگریز کے شکنجۂ انتقام سے بچنے کے لیے ہم پہلے یہ کہتے رہے ہیں کہ یہ مجاہد انگریز کے مخالف نہیں تھے۔ (استقامت، استقلال، ہمت، جرأت اور حق گوئی کی داد دیجئے)

"دوسری طرف سید صاحب کے وہ ماننے والے جن کو وہابی کہا جاتا تھا جب تقریباً نصف صدی تک انگریزی اقتدار سے ٹکراتے رہنے کے بعد چکنا چور ہو گئے اور مجبوراً ان کو اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی، تو عوام کے ہنگامہ کا جواب تو انہوں نے مجالس مناظرہ کی ہنگامہ آرائی اور رسالوں اور پمفلٹوں کی اشاعت سے دے دیا، مگر انگریز کے شکنجۂ انتقام سے بچنے کے لیے لامحالہ ان کو یہ ثابت کرنا پڑا

کہ سید صاحب اور آپ کے ساتھی انگریزی حکومت کے وفادار تھے اور ان کی مجاہدانہ سرگرمیاں صرف سکھ حکومت کے خلاف تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ اعلام نامہ کا یہ فقرہ "سوانح احمدی" صفحہ ۲۳۶ میں جلی قلم سے لکھا گیا ہے:" نہ باسرکار انگریزی مخاصمت داریم و نہ ہیچ راہِ تنازعات کہ از رعایا او ہستیم و بحمایتش از مظالم برایا۔"

("علماءِ ہند کا شاندار ماضی" جلد دوم، ص ۲۸۴)

بھئی! یہ تو بتاؤ کہ سید احمد اور اسماعیل دہلوی نے انگریزی اقتدار کے خلاف وہ کون سا تیر مارا تھا جس کو تم انگریز کے ڈر سے آج تک چھپاتے رہے ہو اور اب اس راز کو طشت از بام کرتے ہو۔ پھر یہ "نصف صدی تک انگریزی اقتدار سے ٹکراتے رہنے" کی بلند بانگی تمہارے ان متقدادں کے قامت پر موزوں کب ہے! تم پچاس برس تک کی بات کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کسی ایک لمحے کی بات کرو، جب انہوں نے انگریزی اقتدار سے ٹکرانے کی خواہش کا اظہار کیا ہو۔ مبالغہ تو اسے کہتے ہیں کہ کم کو زیادہ بتایا جائے، لیکن عنقا کو ہاتھیوں کی ڈار کہنے کو کیا کہتے ہیں

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

مقتدر وہابی لیڈر سید نذیر حسین دہلوی کی سوانح عمری میں اس "تحریک مجاہدین" کی اصلیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"آپ (اسماعیل دہلوی) اپنے شیخِ طریقت سید احمد صاحب کو امام تسلیم کر کے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ جہاد کے لیے پنجاب پہنچے۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی آپ کے اس ارادے میں کسی طرح کی مزاحمت یا پیچیدگی پیدا نہیں کی۔"

("الحیات بعد الممات" ص ۲۰۳)

اب دیکھیے کہ نواب صدیق حسن خاں اس تحریک کو کیا گردانتے ہیں اور ان کی انگریز دوستی کے متعلق کیا کہتے ہیں، مگر پہلے نواب صاحب کے متعلق غلام رسول مہر کی رائے ملاحظہ فرمالیں:

"نواب صاحب مرحوم نے سید صاحب کا ذکر مختلف کتابوں میں کیا ہے ۔ ۔ ۔

پھر نواب کا تعلق فرمانروایانِ ٹونک اور اعزا سید صاحب سے بھی برابر قائم رہا اس لیے انہیں سید صاحب کے خاصے حالات معلوم ہوں گے" (سید احمد شہید ص ۲۲)

نواب صدیق حسن خاں اس بات کی پُرزور اور مدلائل تردید کرتے ہیں کہ تحریک مجاہدین والے انگریزوں کے خلاف تھے :

"نہ انہوں نے سرکارِ انگریزی سے کبھی جہاد کیا اور نہ ہندوستان میں جہاد کا فتویٰ جہاد کا لکھا۔ . . . اسی طرح جو تصنیف سید احمد شاہ صاحب بریلوی اور ان کے مریدوں کی ہے۔ اس میں کہیں بھی ذکر وہابیوں کا نہیں ہے اور نہ مسئلہ جہاد کا لکھا ہے . . . "تقویۃ الایمان" مؤلفہ مولوی اسمٰعیل دہلوی ہے، اس میں ذکر ردِ شرک و بدعت کا ہے۔ کہیں وہابیوں کا او مسئلہ جہاد کا پتا بھی نہیں . . . . گورنمنٹ اگر ساری کتابوں کو جمع فرما کر ملاحظہ کرلے گی، تو کسی کتاب میں ان کتب سے مسئلہ جہاد کا یا بغاوت کا سرکارِ انگلشیہ سے یا فساد سکھانے کی کوئی بات نہ پاوے گی۔"

("ترجمان وہابیہ" ص ۵۲، ۵۱)

ے کرشمہ گرمِ سوال است، لب مکن رنجہ
کہ احتیاج بہ پرسیدن زبانی نیست

ایک اور مشہور "وہابی" کا اعتراف ملاحظہ فرمایئے اور سوچیے کہ یہ کس کس کو دشنام طرازی کا ہدف بناتے رہیں گے۔ ان کی تو ساری کتابوں میں یہ حقیقت کسی نہ کسی طرح اُبھر آئی ہے :

"سید صاحب، مولوی اسماعیل صاحب نے انگریزوں سے جہاد کرنے کا ارادہ نہیں کیا اور مولوی اسمٰعیل صاحب نے کلکتہ میں اپنی مجلس وعظ میں برملا کہہ دیا کہ ہم کو انگریزوں سے جہاد کرنا جائز نہیں۔"

(اشاعت السنّۃ، از مولوی محمد حسین بٹالوی،
ص ۵، ضمیمہ ۶ - جلد ۲)

پہلے تو سب لوگ یہ حقیقت ظاہر کرتے رہے کہ سید احمد اور شاہ اسماعیل انگریزوں کے وفادار اور ایجنٹ تھے، مگر اب دینی محاذ پر فضل حق اور ان کے شاگردوں سے شکست کھانے کے بعد سیاسی طور پر مذکورہ بالا دونوں "مجاہدوں" کو لیڈر بنانے کی خواہش کی جا رہی ہے اس واقعے کا اعتراف ملاحظہ کیجئے :

"حضرت کی شہادت کے بعد جو حالات پیدا ہوئے .... اس زمانے میں جو کتابیں حضرت شہید اور ان کے مقاصد پر لکھی گئیں، ان میں اس کو بار بار ثابت کیا گیا کہ انگریزوں کے خلاف حضرت سید احمد شہید نے کوئی حرکت نہیں کی۔"
"تحریک جہاد کا قیمتی سرمایہ" (پیش لفظ مکتوبات سید احمد شہید)
(از محمد اقبال سلیم گاہندری۔ ص ۴)

سرسید نے ایک اور پہلو سے انگریزوں سے ان حضرات کی "برخورداری" کی وضاحت کی ہے :

"وہ اپنے بال بچوں اور مال و اسباب کو گورنمنٹ انگریزی کی حفاظت میں چھوڑ گئے تھے اور ان کے مذہب میں اپنے بال بچوں کے محافظوں پر حملہ کرنا نہایت ممنوع ہے۔" (مقالات سرسید، حصہ نہم، ص ۱۴۸)

مسعود عالم ندوی صاحب اس "تحریک مجاہدین" کو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک سمجھتے ہیں، لیکن اس بات کو ماننے پر مجبور ہیں کہ انگریزی حکومت کی پالیسی کے مطابق ان "مجاہدوں" نے سکھوں سے جنگ لڑی، ملاحظہ کیجئے :

"اُس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ جاری تھی، راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سائے میں جا کر پناہ لی۔ اُس وقت تک پنجاب پر قابض ہو چکے تھے۔ حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہوگا۔

حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ مجاہدین کے ذریعے سکھوں کو طاقت دی جاتے اسی لیے شروع شروع میں مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی، لیکن پنجاب کا اکثر حصہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا، تو مجاہدین حکومت کی نگاہ میں کھٹکنے لگے، مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے نبرد آزما ہونا خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔"

("ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مسعود عالم ندوی، ص ۵۵، ۵۴)

از راہِ کرم اس اقتباس کو بار بار پڑھیے، کئی مسائل اس میں حل ہوگئے ہیں جب پنجاب پر انگریز قابض ہوجاتے ہیں، تو راجہ گلاب سنگھ پر حملے سے مجاہدین کو روک دیتے ہیں۔ "شروع شروع" میں مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ انگریز مجاہدین کے ہاتھوں سکھوں کی طاقت توڑنا چاہتے تھے اور مجاہدین ان کی یہ ڈیوٹی انجام دے رہے تھے اور مجاہدین کے نزدیک حکومتِ انگلشیہ سے نبرد آزما ہونا "خواہ مخواہ" بھی تھا اور خلافِ مصلحت بھی، اللہ اکبر!

اب ان لوگوں کے ہاتھوں عبید اللہ سندھی صاحب کا جو حال ہوگیا، وہ تو بہر حال دینی ہوگا، مگر انہوں نے "جماعتِ مجاہدین" کا گزارا، انگریزی حکومت کے نان و نفقے پر قرار دیا ہے دیکھ لیجئے:

"ایک دفعہ میں سرحد پار بیز کے مقام پر گیا . . . . . میں اس امید میں کہ شاید سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی جماعتِ مجاہدین میں زندگی کی کوئی کرن دکھائی دے، ادھر چل دیا۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حد درجہ افسوسناک اور قابلِ رحم تھا، وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ جماعت جو "مجاہدین" کے نام نامی سے یاد کی جاتی ہے، کس بری حالت میں ہے اور اس کی گزران اور اس کی زندگی کس طرح صاحبزادہ عبد القیوم خاں کی وساطت سے انگریزی حکومت کی رہینِ منت ہے۔"

(افادات و ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی۔ از محمد سرور، ص ۳۶۲)

حضرات گرامیٔ قدر! آپ نے کبھی یہ دیکھا کہ حالات و واقعات سامنے ہوں، متعلقہ لوگوں کی اپنی تحریریں، تاریخ کی کتابیں، متعلقہ لوگوں کے ساتھیوں کی شہادتیں سامنے ہوں، آپ انہیں مسلمات بھی سمجھیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہیں کہ ہمارے خیال میں یہ واقعات درست نہیں۔ انگریزوں کی مخالفت کا اسماعیل و سید احمد کے واقعات و حالات میں کہیں ذکر نہیں، اس کا انہیں بھی اعتراف ہے۔ انگریزوں سے ان کی معاونت کو آپ مسلمات میں سے سمجھتے ہیں، لیکن پھر بھی کہتے ہیں کہ وہ اصل میں انگریز کے خلاف ہی تھے، سُبحان اللہ!

"مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا، بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا، اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی، لیکن ان مسلمات کے باوجود بھی احقر کا یہ خیال ہے کہ حضرت شہید کی تمام مساعی عام استیلاء ملت اور بالخصوص انگریزوں سے جہاد حق اور استخلاصِ وطن کے لیے تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم کسی طرح تسلیم نہیں کرتے کہ شاہ اسمٰعیل شہید اپنے استاد اور عمِ محترم اور شیخ الشیخ (دادا پیر) حضرت شاہ عبدالعزیز کے اس فتوے کے برخلاف، کوئی رائے رکھتے تھے۔"

(مضمون "اسلامی حریت کا علمبردار" از محمد میاں)
(مصنف علماء ہند کا شاندار ماضی)
(کتاب "شاہ اسماعیل شہید" مرتبہ عبداللہ بٹ۔ ص ۱۹۲)

○

انگریزوں

کی

دعوتیں!

خم پہ خم پی گئے ہیں اک حضرت
پیٹ ہے یا پکھال چمڑے کی

"تحریکِ مجاہدین" کے رہنماؤں کا انگریزوں کے خلاف جہاد کے بارے میں موقف سامنے آچکا ہے۔ انگریزوں سے ان کی وفاداری کے اعلانات اور واقعات پیش کیے جاچکے ہیں۔ انگریزوں کی ہوسِ اقتدار سے نبرد آزما لوگوں کو یہ مجاہد بُرا سمجھتے ہیں اور اس بات کا برملا اعلان کرتے ہیں کہ ان کی عملداری میں دین کو ہر طرح سے خیر تیت ہے، اس کے بعد انگریزوں سے جنگ لڑنا ان کے "مذہب" کی رو سے جائز نہیں اور ہر بات پر انگریزوں کی وفاداری اور خدمت گاری کا اعلان کرتے رہے۔

اب آپ "مصورانِ معتبر" کی بنائی ہوئی تصویر کے علی الرغم شاہ اسمٰعیل اور سید احمد کی ذات کے اس پہلو کی عکاسی ملاحظہ کریں، جس میں ان کے ساتھ انگریزوں کے مراسم ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے انگریز سرپرستوں کو ان کی تحریک کی کامیابی کے لیے کتنی جلدی تھی، وہ انہیں کھلا پلا کر تیار کرتے تھے اور یہ بھی انگریزوں کا مالِ شیرِ مادر کی طرح ڈکار لیے بغیر ہضم کر جاتے تھے ؎

مارا ہوسِ صحبتِ جاں پرور یار است
ورنہ غرض از بادہ، نہ مستی نہ خمار است

سب سے پہلے تو سید احمد بریلوی کے سب سے "عظیم سوانح نگار" کی زبان سے دعوت کھانے کی بات سنیے "ایک انگریز کا سارے قافلے کی دعوت کرنا" کے زیرِ عنوان لکھتا ہے:

"ایک انگریز گھوڑے پر سوار بہت سا کھانا قسم قسم کا بہنگیوں میں رکھوائے ہوئے چلا آتا ہے۔ اس نے کشتی کے نزدیک آکر پوچھا کہ پادری صاحب کہاں ہیں؟ ...... بعد سلام و مزاج پرسی کے عرض کیا کہ تین روز سے میں نے نوکر واسطے لانے خبر تشریف آوری حضور اس طرف تعینات کر رکھے تھے، سو آج انہوں نے مجھ کو خبر دی یہ ماحضر واسطے حضور اور کل قافلے کے تیار کرکے لایا ہوں۔ براہ بندہ نوازی اس کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کردو، قریب دو گھڑی تک وہ انگریز حضور میں حاضر ہوا۔"

(سوانح احمدی، از جعفر تھانیسری ص ۴۹)

جعفر تھانیسری صاحب کو تو اسی قسم کی حقیقتیں لکھ جانے پر "دوستوں" نے غلط گو قرار دے ڈالا ہے، لیکن انگریزوں کی روٹیوں پر گزارا کرنے کا یہ سارا واقعہ ان صاحب کے علاوہ ایک ایسے صاحب بھی لکھتے ہیں جو نہ صرف چشم دید گواہ ہیں، بلکہ شریک طعام بھی تھے، کیونکہ سید احمد بریلوی کے سگے بھانجے ہیں، سید محمد علی ؎

لرز رہی ہے مری لو پڑے پڑے ہی ظفر
وہ لے چلے ہیں کہاں سامنے ہوا کے مجھے!

سید محمد علی کے بارے میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"سید صاحب (سید احمد بریلوی) کے چار بھانجے تھے، بڑے سید محمد علی، جنہوں نے ابتدا سے آغاز جہاد تک کے حالات لکھے اور اس کتاب کا نام مخزن احمدی رکھا۔ وہ ایک مرتبہ چھپ بھی گئی تھی، مگر اب کمیاب بلکہ نایاب بھی ہے۔"

(افادات مہر ص ۱۳۹)

لہ اب دوبارہ چھپ گئی ہے اور مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے
قیمت -- ۱۲

س نایاب کتاب کا ایک نسخہ مکرم حکیم محمد موسیٰ امرتسری (بانی وصدر مرکزی مجلسِ رضا لاہور) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"انگریزی برا سپے مع چند محافہا پُر از طعام متصل کشتی رسید و پرسید کہ پادری صاحب کجاست، حضرت از کشتی جواب دادند کہ ایں جا موجودم تشریف بیارند فی الفور از اسپ فرود آمدہ و کلاہ خود بدستِ خود ہمچناں کشتی رسید و بعداز پرسشِ حال یک دگر بعرض رسانید کہ از سہ روز خبر داران ما برائے اخبار قافلہ شریف ہمراہی حضرت موجود بود امروز خبر آوردند کہ اغلب کہ حضرت مع قافلہ امروز بمحاذات مکانِ شما فرو کش خواہند شد بمجرد ایں بود فرحت جاوید برائے ترتیب ماحضری تا غروبِ آفتاب مشغول بودم، چوں طیار گردید بخدمت حاضر آوردم، حضرت ملازمان را مامور ساختند تا آں طعمہ را از ظروفِ ادا فی ایشاں برآوردہ ظروفِ خویش بگیرند، مامورین حسب الامر آوردہ در قافلہ تقسیم ساختند۔"

("مخزنِ احمدی" از سید محمد علی ص ۶۷
(مطبوعہ مطبع مفیدِ عام آگرہ)

یہی واقعہ ابوالحسن علی ندوی نے "سیرتِ سید احمد" حصہ اول میں تحریر کیا ہے (ص ۲۱۷،۱۸)
ظاہر ہے کہ ہر روز جو انگریز ان کی دعوتیں کرتے تھے، ان سب کا ذکر تو نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر چونکہ یہ ایک آدھ بار کا واقعہ نہیں، اس لیے ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"موضع اسرولی سے چار میل پہلے حضرت کے پاس ایک انگریز کی ہندوستانی بیوی آئی اور کھانے کی دعوت دی، انہوں نے انکار کر دیا پھر وہ فرنگی آیا، تو آپ نے فرمایا تمہاری دعوت کیوں نہ قبول کریں گے۔ سو آپ نے دعوت قبول فرمائی، اس دن اس کی دعوت کھائی۔"

• ("سیرت سید احمد شہید" حصہ اول، ص ۲۰، ۲۱۹)

حاشیے میں ندوی صاحب نے لکھا ہے کہ "اس انگریز کی ہندوستانی بی بی کی دعوت اس لیے قبول نہیں کی تھی کہ وہ انگریز کے پاس تھی، یہ تعلق ناجائز تھا اور اس سلسلے کا سب مال حرام اور ناجائز تھا۔" (ص ۲۲۰)

اب اس سوال کو تو علمائے دین ہی حل کرسکتے ہیں کہ ان انگریز غاصبوں کا مال کھانے کا کیا جواز تھا، جنہوں نے اسلامیانِ ہند سے مختلف حربوں کے ذریعے حکومت چھین لی تھی اور مختلف غیرت مند طبقے ان کے اقتدار سے بیزار تھے اور یہ بات بھی علمائے کرام ہی بتا سکتے ہیں کہ جو ہندوستانی بی بی کسی انگریز کے پاس ناجائز طور سے رہتی تھی، اس کا کھانا ناجائز ہو تو جو انگریز کسی ہندوستانی عورت کو "مدخولہ گورنمنٹ" کیے ہوئے ہو، اس کے کھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ پھر یہ بات بھی واضح نہیں ہے کہ اس کھلانے کے عمل میں اس ہندوستانی بی بی کا عمل دخل کس طرح ختم ہوا تھا۔

بہرحال انہوں نے داشتہ کا کھانا قبول نہیں کیا، زناکار انگریز کا کھانا قبول فرمایا آخر یہ بھی تو دیکھنا ضروری ہے کہ کیا کھا رہے ہیں، کوئی غلط چیز تو نہیں کھا گئے ؎

حریفِ صافی و دوری نہ ای خطا ایں جاست

تمیزِ ناخوش و خوش می کنی بلا ایں جاست

مگر میں تو اس مسئلے میں الجھا ہوا ہوں کہ سید احمد صاحب سفر کے عالم میں تھے، نئی جگہ پہنچے تھے، ایک ہندوستانی بی بی آئیں، تو یہ بات انہوں نے کیسے جان لی کہ وہ خاتون کون ہے اور کس انگریز کی داشتہ ہے اور انہیں انگریز کی دعوت قبول کرنا ہے، خاتون کی نہیں، کہیں الہام کے بعد یہ صورت اپنے "عالم الغیب" ہونے کی تو نہیں؟

اب ایک اور مسئلہ توجہ طلب ہے کہ انگریزوں کے "یہ مخالف" فوج اکٹھی کرتے رہے لوگوں سے ٹیکس وصول کرتے رہے۔ فوج لے کر اسلام کے تحفظ کی جنگ لڑنے سکھوں اور سرحدی مسلمانوں کے علاقے کی طرف چل پڑے۔ طویل سفر ایک مدت میں انہوں نے طے

کیا۔ انگریز ان تمام معاملات میں کبھی ان سے نہیں اُلجھے، انہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا
کہ فوج کو لے کر کدھر جا رہے ہو۔ وہ راستے میں ان کے کام و دہن کی تواضع میں بھی مصروف
رہے اور انتہا یہ ہے کہ جب یہ لوگ سرحدی علاقے میں پہنچ گئے تو ان کی کچھ ہنڈیاں، جو
انگریزی علاقے میں تھیں، اُن کی رقوم وصول کر کے انگریزوں نے انہیں سرحد بھجوائیں
انگریز اپنے دشمن کے ساتھ اتنا محبت کا سلوک کرے، تاریخ میں پہلے تو یہ بات کبھی سامنے
نہیں آئی، لیکن یہ "تاریخ" تو ہماری اپنی ہے، ہم جیسے چاہیں گے بنائیں گے۔

"سید صاحب جہاد میں مصروف تھے، اس وقت ایک ہنڈی سات
ہزار روپے کی جو بذریعہ ساہوکاران دہلی مرسلہ محمد اسحاق صاحب بنام
سید صاحب روانہ ہوئی تھی، ملکِ پنجاب میں وصول نہ ہونے پر اس سات ہزار
کی واپسی کا دعویٰ عدالتِ دیوانی میں دائر ہو کر ڈگری ہوا، پھر ہنگام اپیل
عدالتِ عالیہ دیوان ہائی کورٹ آگرہ میں بھی حکم ڈگری بحکم مدعی بحال رہا۔"

("تواریخ عجیبہ" از جعفر تھانیسری، ص ۸۹)

تھانیسری صاحب نے تو مشتے نمونہ از خروارے ایک ہنڈی کی ادائیگی کا ذکر
کیا ہے۔ خود غلام رسول مہر نے اس سلسلے کو بہت طویل قرار دیا ہے۔ یہ ہنڈی ہی کا ذکر نہیں
ہنڈیوں کی بات ہے:

"سید احمد شہید کے پاس ہندوستان سے جو ہنڈیاں آتی تھیں ان میں
اشرفیوں کا بھی ذکر ہے اور روپوں کا بھی۔"

("افاداتِ مہر" از ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی)
(مکتوب مرقومہ، ۱۸ر جنوری ۱۹۶۲ء، ص ۹۵)

انگریز
کے
جاسوس

لوگ اکثر اپنے چہروں پر چڑھا لیتے ہیں خول
تو جسے سونا سمجھتا ہے کہیں پیتل نہ ہو

ان تمام حالات و واقعات کی بناء پر جو اظہر من الشمس ہیں اور جن کو چھپانے کی کوشش کے باوجود قلم کاران عصر حاضر اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اگر سرحدی مسلمانوں نے سید احمد اور اسماعیل دہلوی صاحبان اور ان کے ہمراہیوں کو انگریز کا جاسوس سمجھا تو ظاہر ہے کہ غلط نہیں سمجھا، کوئی ایک بات بھی تو اس حقیقت کی تردید نہیں کرتی:

"جب حضرت شہید بعزم جہاد صوبہ سندھ اور سرحد کے علاقے میں داخل ہوتے (جو اس وقت انگریزی عملداری میں نہ تھے) تو ان کے متعلق عام طور سے یہ شبہ کیا گیا کہ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں اور یہ شبہ اس بنا پر کیا گیا کہ حضرت شہید کے تعلقات انگریزوں سے نہایت درجہ خوشگوار تھے۔"

(حاشیہ مقالات سرسید، حصہ شانزدہم)

(از محمد اسمٰعیل پانی پتی، ص ۲۵۱)

خود غلام رسول مہر کو یہ ماننا پڑا ہے کہ سرحد کے علماء نے سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس قرار دیتے ہوئے فتویٰ دیا:

"وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں، ایک نیا دین انہوں نے نکالا ہے، کسی ولی اور بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو بُرا کہتے ہیں

انگریزوں نے انہیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بناکر بھیجا ہے، ان کی باتوں میں نہ آنا، عجب نہیں، تمہارا ملک چھنوادیں۔"

("سید احمد شہید" حصہ دوم، از غلام رسول مہر، ص ۲۸۰)

"کاردمیں جوان شاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید صاحب سے ملاقات کے لیے آئے اور ایک بڑا بھینسا بطورِ نذر پیش کیا۔ انہی سے معلوم ہوا کہ لوگ عام طور پر سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھتے ہیں، اسی لیے بدکتے ہیں۔"

("سید احمد شہید" از غلام رسول مہر، ص ۳۹۷)

انگریزوں کے خلاف

جہاد کے بارے میں

وہابیوں کا موقف

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام رُوح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے، لباس میں

وہابیوں کے عظیم قائد سید احمد بریلوی اور ان کے خلیفہ بمنزلہ حضرت عمر (نعوذ باللہ) مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی گفتار و کردار سے انگریز دوستی ٹپکتی رہی۔ انہوں نے انگریز کا فرمانبردار رعایا ہونے کا فخریہ انداز میں اعلان کیا۔ انگریز کے مقاصد حکمرانی کے لیے جہاد کیا، تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے پیرو، انہی کے نقوش قدم کو مشعل راہ نہ بناتے۔

"جنگِ آزادی کے مخالف کون" میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ جنگِ آزادی میں وہابیوں کے مخالفوں نے حصہ لیا اور یہ لوگ سرٹیفکیٹوں اور نقد انعامات کے پیچھے پڑے رہے۔ پھر یہ کیوں نہ ہوتا کہ وہابی انگریز کی وفاداری پر افتخار کا اظہار کر سکیں اور اس کے خلاف جہاد کو خلافِ اسلام قرار دیں ؎

فریب دینے کی توفیق ہے تو دے دیجے
کہ زہر جان کے پینا مرا شعار نہیں

"مولوی محبوب علی دہلوی نے زمانۂ غدر کی لڑائی کی نسبت جس میں بخت خاں باغی نے ان کو شریک کرنا چاہا تھا، جہاد ہونے کا انکار کیا، اور مولوی محمد حسین لاہوری بھی اب تک بذریعہ پرچہ اشاعۃ السنۃ جہاد کا نسبتِ گورنمنٹِ ہند کے انکار کرتے ہیں۔"

(سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور۔ ۱۰ نومبر ۱۸۷۶ء)

ملاحظہ فرمائیے نواب صدیق حسن خاں برٹش گورنمنٹ کی کاسہ لیسی کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم قرار دیتے ہیں اور انگریز کے خلاف جہاد میں مصروف علماء خواص اور عوام کو فسادی اور عاقبت نااندیش کہتے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ حضرت! آپ کو انگریز کی نمک حلالی کرنی ہے، تو کیجئے۔ حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ السلام والصلوٰۃ کا ارشاد آپ نے انگریزوں کی حمایت میں کہاں سے نکال لیا؟

"پس فکر کرنا ان لوگوں کا جو اپنے حکمِ مذہبی سے جاہل ہیں اس امر میں کہ حکومت برٹش مٹ جاوے اور یہ امن و امان جو آج حاصل ہے۔ فساد کے پردہ میں جہاد کا نام لے کر اٹھا دیا جائے، سخت نادانی و بے وقوفی کی بات ہے، بھلا ان عاقبت نااندیشوں کا چاہا ہوگا، یا اس پیغمبرِ صادق کا فرمایا ہوا جس کا کہا ہوا آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔"

(ترجمانِ وہابیہ" از نواب صدیق حسن خاں، مطبوعہ ۱۳۱۲ھ ص ۷)

آج کے "وہابیت خواہوں" سے پوچھیے کہ کیسا امن کونسی آسائش اور کہاں کی آزادگی آپ انگریزوں کے زمانۂ اقتدار کی ثابت کرسکتے ہیں، مگر نہیں، اگر یہ لندن میں ہوں تو پھر بھی یہی فتوی دیں کہ سرکار کی خوشنودی حلِ مشکلات کا باعث ہوتی ہے؛

"جو امن و آسائش و آزادگی اس حکومتِ انگریزی میں تمام خلق کو نصیب ہوئی ہے، کسی حکومت میں نہ تھی۔"

(ترجمانِ وہابیہ، ص ۹)

مولوی محمد حسین بٹالوی وہابیوں کے "مایہ ناز" عالم ہیں۔ انہوں نے اسلاف کے "جہاد" کی قلعی یوں کھول دی ہے کہ اپنی کتاب کے سرورق پر یہ لکھا ہے؛

"پنجاب کے نامور ہر دلعزیز لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچیسن صاحب بہادر

کے سی ایس آئی وغیرہ وغیرہ نے اپنے نام نامی سے اس کا ڈیڈیکیٹ ہونا منظور فرمایا اور اس میں مسئلہ جہاد کی ایسی تحقیق و شرح ہوتی ہے، جس کی نظیر اس وقت تک کسی کتاب میں جو اس باب میں تالیف و مطبوع ہو چکی ہیں، پائی نہیں گئی۔"

"التماس" کے عنوان سے لکھا ہے :

"ہم ان ناموں کو بشمول رسالہ اقتصاد بذریعہ اشاعۃ السنۃ گورنمنٹ میں پیش کریں گے، اور سلطنتِ انگلشیہ کی نسبت ان کی وفاداری، اطاعت شعاری کو خوب خوب شہرت دیں گے۔"

(الاقتصاد فی مسائل الجہاد، حصہ اول)

(از ابو سعید محمد حسین لاہوری، مطبوعہ وکٹوریہ پریس)

"بعض سرحدی نادان ناواقف از احکامِ اسلام و قرآن تن تنہا ایک سیر آٹا یا ستو باندھ کر غازی یا شہید ہونے کی نیت سے چل پڑتے ہیں اور کسی کیمپ یا چھاؤنی انگریزی میں پہنچ کر کسی افسر یا فوجی ملازم کو مار ڈالتے ہیں، پھر اس کی سزا میں پھانسی پاتے ہیں، یہ اور بھی فساد و بغاوت اور عناد ہے۔ ایسی صورتوں سے اپنی جان کو ہلاک کرنا حرام موت مرنا ہے اور بہشت کی خوشیوں سے محروم رہنا اور ایسے فسادوں کو جہاد سمجھنا اور اس میں شہادت کی ہوس کرنا سراسر جہالت و حماقت ہے۔"

("الاقتصاد فی مسائل الجہاد" ص ۱۰)

غلام رسول مہر ان محمد حسین بٹالوی کے متعلق یہ ماننے پر مجبور ہیں :

"مولانا محمد حسین بٹالوی نے یقیناً جہاد کے خلاف لکھا تھا۔ یہ سرسید کا اثر ہو یا مولانا کی رائے بجائے خود یہی ہو . . . ."

("افاداتِ مہر" ص ۲۳۱)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ "انہوں نے بھی" انگریزوں سے جہاد کے خلاف لکھا جو اس طبقے کے لیے نئی بات نہیں، اصل میں جب آپ انگریزوں کی وفاداری کے میدان میں کھیلنے کے دھنی ہیں، تو پھر آپ ایسے معاملات میں خاموشی کو شعار کیوں نہیں بنا لیتے کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں، تو صورت عجیب ہو جاتی ہے ؎

تم چُپ رہو تو اس میں تمہارا بھرم بھی ہے
یوں سب کے سامنے تو نہ ہکلاؤ دوستو!

اس کے بعد غلام رسول مہر نے ایک اور اہل حدیث رہنما ثناء اللہ امرتسری کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں لاہور میں ہونے والی اہل حدیث کانفرنس میں سیکرٹری کی حیثیت سے اغراض و مقاصد کی پہلی شق پیش کی تھی :

"حکومتِ برطانیہ سے وفاداری"

اسے کہتے ہیں : "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے"

○

انگریزوں کے ایما پر

سِکھوں سے لڑائی

جلوۂ کاردانِ مانیست بہ نالۂ جرس

عشقِ تو راہ می بُرد، شوقِ توزادمی دہد

جب "تحریک مجاہدین" کے قائدین نے اپنی سرگرمیوں کا رخ تصنیف و تالیف سے جہاد کی طرف موڑا، اس وقت تحریک کے قائدین خود اور ان کے ساتھی، ان کے پیرو سب یہی کہتے رہے کہ ان کی لڑائی "سکھوں اور منافق مسلمانوں" کے ساتھ ہے۔ انگریز کے ساتھ نہیں۔ اب ہمارے دوستوں نے اس لڑائی کا رُخ انگریزوں کی طرف موڑ دینے کی کوشش کی ہے۔ میری یہ بات بھی گزشتہ گزارشات کی طرح بے دلیل نہیں ہے۔ تحقیق جدید کے سب سے بڑے داعی غلام رسول مہر بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ گزشتہ سوا سو سال سے یہ سمجھا اور کہا جاتا رہا ہے کہ ان "مجاہدوں" کی لڑائی سکھوں سے تھی، لیکن اب وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں، انگریزوں کے خلاف تھی۔ یاد رہے کہ سوا سو سال کا مطلب سوا سو سال ہی ہے یعنی "تحریک" کے زمانے سے لے کر اب تک سب لوگوں کو یہی علم تھا، انکشاف اب ہوا ہے۔ سوچنا چاہیے کہ یہ انکشاف مہر صاحب پر کشف کی صورت میں تو نہیں ہوا ان کے ممدوح سید احمد صاحب کو نعوذ باللہ الہام ہوتا تھا، کہ یہ لڑائی انگریزوں کے ایما پر سکھوں کے خلاف نہیں تھی، بلکہ خود انگریزوں کے خلاف تھی۔

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردہ
جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

"آیا وہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھایا جا رہا ہے۔" ("سید احمد شہید" از غلام رسول مہر، ص ۲۵۰)

شیخ محمد اکرام نے "موجِ کوثر" مطبوعہ فیروز سنز لاہور کے صفحہ ۱۶ پر "سوانح احمدی" مصنفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری، "تاریخ پنجاب" از ایس ایم لطیف اور THE PUNJAB HUNDRED YEARS AGO از GARRETT کے حوالے سے بتایا ہے کہ اثنائے راہ ملک پنجاب سید احمد بریلوی نے "سکھوں کے مظالم" دیکھ کر فرمایا کہ "میں عنقریب سکھوں سے جہاد کروں گا۔"

مشہور مستشرق گارسن دتاسی سید احمد بریلوی کے متعلق لکھتا ہے:

"وہ بیس سال کا عرصہ ہوا کہ سکھوں کے خلاف جہاد کرتا ہوا مارا گیا۔"

(طبقات الشعرائے ہند)

(تلخیص "تاریخ ادب اُردو" از گارسن دتاسی، ص ۲۹۵)

(مطبوعہ ۱۸۴۸ء)

"سید احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف جو جہاد کیا تھا، شاہ اسماعیل اس میں ان کے دستِ راست رہے۔"

(اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز لاہور، ص ۹۸)

دوسرے مقام پر ہے:

سید احمد شہید بریلوی نے لوگوں کو توحید اور ترکِ بدعات کی تلقین کی... انہی دنوں پنجاب میں سکھوں کے ظلم و ستم کی روداد یں سننے میں آئیں تو آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا۔"

(اُردو انسائیکلوپیڈیا، ص ۸۶۶)

ہزارہا مومن حضرت سید احمد شہید بریلوی کی ندائے جہاد پر لبیک کہتے ہوئے ان کے پرچم تلے اکٹھے ہو گئے اور ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ظالم سکھوں کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ یہ جہاد پانچ سال سے زیادہ عرصہ تک جاری

"۔۔۔۔۔اس کے بعد مجاہدین میں اندرونی اختلافات رونما ہونے لگے۔"

(ماہنامہ ماہِ نو کراچی، تحریک پاکستان نمبر، ص ۲۶، ۲۵)

"مولوی شاہ اسماعیل نے اپنے غازیوں کی معیت میں پشاور کے نزدیک ہشت نگر میں کچھ عرصہ قیام رکھا اور پھر پرچم محمدیہ اٹھا کر سکھوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔"

("انیسویں صدی کا مجاہد مصلح" از ڈاکٹر محمد باقر)

(کتاب "شاہ اسمٰعیل شہید" مرتبہ عبداللہ بٹ، ص ۴۶)

الیگزینڈر گارڈنر لکھتا ہے:

"بابوڑ میں میری آمد سے کوئی چار سال پہلے انہوں نے (سید احمد نے) پشاور اور اٹک کے درمیان یوسف زئی کے پہاڑوں پر پیغمبر کا سبز پرچم لہرایا اور سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔"

(انیسویں صدی کا مجاہد مصلح ۔۔۔۔ ایضاً، ص ۴۸)

"تحریک کے شیدا ئیوں نے جس وقت سکھوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کر دیا، وہ عین حالات کا تقاضا تھا، تحریک میں اتنی فوجی قوت نہیں تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کرتے۔"

("چند تاریخی غلطیاں" از ابوالمعانی)

(کتاب "شاہ اسمٰعیل شہید" ص ۲۲۲)

ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر غاصب حکمرانوں کے خلاف لڑنے کی طاقت نہ ہو تو ان غاصب حکمرانوں کے مخالفوں سے ٹکرا جانا چاہیئے۔ اگر ہندوستان بھر پر قبضے کی راہ میں انگریز کی رکاوٹ رکھے، دُور نہ ہو تو ان غیرت مند اور جیالے سرحدی مسلمانوں کے خلاف "جہاد" کر دینا چاہیئے جو ہر بیرونی طاقت کو ہمیشہ ناکوں سے چنے چبواتے رہے ہیں یہ کس قسم کا جہاد ہے

مری پائمالیوں کو یہ وفا کا حل غلط ہے
کوئی اور آڑے کرے کوئی اور چال چل کے

"نجد میں امام محمد بن عبدالوہاب کی کامیابی نے شاہ اسماعیل کی ہمت اور جرأت اور بھی بڑھا دی، میدان جنگ منتخب ہوا، قرعہ فال بالاکوٹ کے نام نکلا۔ ہندوستان بھر کے مجاہد وہاں جمع ہونے لگے۔ اپنے آباؤ اجداد کے خیالات کے مطابق شاہ اسمٰعیل ہندوستان میں پاکستان یعنی خلافت اسلامیہ کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔"

(مضمون "تجدید و احیائے ملت" از پروفیسر عبدالقیوم)
("کتاب شاہ اسمٰعیل شہید" ص ۱۴۲)

یہ کیسی خلافت اسلامیہ ہے، جس کی بنیاد اسلام کے ازلی دشمن نصاریٰ کی امداد سے رکھی جاتی ہے جو نصاریٰ کے مخالفین سے جنگ کرنا سکھاتی ہے جو مسلمانوں کو فرقوں میں تقسیم کرتی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کو دلوں سے مٹانے کے لیے کوشاں ہے ؎

چہ قیامت است جاناں کہ بعاشقاں نمودی
رخ ہم چو ماہ تاباں، دل ہم چو سنگ خارا

"انگریزی ڈپلومیسی کا یہ عجیب و غریب کرشمہ تھا کہ حضرت شہید کے لیے سکھوں پر حملہ کرنے کی سہولتیں پیدا کیں اور پھر سکھ حکومت انگریزوں سے معاہدہ کے باعث مجبور تھی کہ حضرت شہید کو راستہ نہ دیتی اور جب حضرت شہید کی جمعیت ایک لاکھ سے متجاوز ہونے لگی، تو آپ کی جمعیت میں عقائد کے متعلق اختلاف پیدا ہوا یا کروا دیا گیا۔" (اسلامی حریت کا علمبردار، از محمد میاں)
(کتاب شاہ اسمٰعیل شہید" ص ۱۹۴)

عقائد کے متعلق اختلاف تو اسمٰعیل دہلوی صاحب کی ابتدا تھی۔ اس تحریک کی اساس ہی مسلمانوں کی دین اور پیغمبرِ دین سے محبت کو کم کرنے پر تھی، چنانچہ اسماعیل دہلوی کی "تقویۃ الایمان" کے رد میں بے شمار کتابیں فوراً لکھی گئیں۔

پھر یہ حقیقت بھی ایک بہت بڑا سوال ہے کہ ایک لاکھ کی جمعیت انگریز کی نگاہوں سے پوشیدہ کیسے رہی اور وہ اس سے صرفِ نظر کس مقصد کی خاطر کرتے رہے؟

محمد میاں مصنف "علمائے ہند کا شاندار ماضی" اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

"الحاصل انگریزی حکومت نے ہندوستان کے تمام صوبوں پر مضبوطی سے قبضہ کر لیا، صرف پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد اور ملتان اس کے اقتدار سے خالی تھا، مگر اس پر سکھوں کے قبضے نے شمال مغربی ہندوستان اور اس کے آس پاس کے مسلمانوں کی راہ بند کر دی تھی۔" (شاہ اسمٰعیل شہید، ص ۱۸۵)

اور "تحریک مجاہدین" کا میدان کارزار پنجاب اور سرحد بنے جو انگریزوں کے مکمل ہندوستان پر کنٹرول کے راستے میں رکاوٹ تھے اور "مجاہدوں" کے کئی سیرت نگاروں کے بقول وہ کشمیر جانے کا ارادہ بھی کرتے تاکہ انگریزوں کا کوئی مخالف ایسا نہ رہ جائے، جن سے یہ "جہاد" نہ کر لیں۔

"مسلمانوں کی مذہبی روایات خطرے میں تھیں، شاہ شہید اور ان کی جماعت اس بارود میں چنگاری پھینکنے کا انتظار کر رہی تھی۔ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔"

(اسلامی انقلاب کا علمبردار از سعید احمد ایڈیٹر برہان دہلی)

(کتاب شاہ اسمٰعیل شہید، ص ۱۷۳)

(کبھی کسی "موقعے" سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کے خلاف بھی تو جہاد کر لیا ہوتا)

"مکاتیب سید احمد" کی اشاعت کا مقصد محمد جعفر تھانیسری مؤلف مکتوبات سید احمد شہید یوں بیان کرتے ہیں:

"سید صاحب کا جہاد صرف اس وقت کے ظالم سکھوں سے تھا جنہوں نے
اس وقت پنجاب کے مسلمانوں پر قیامت برپا کر رکھی تھی نہ کہ سرکار انگریزی سے"
("مکتوباتِ سید احمد شہید"۔ ص ۳۱۰)
مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

"(اسماعیل دہلوی نے) اس عزم کا اظہار کیا کہ سکھوں کے خلاف جو مسلمانوں
کو پنجاب اور سرحد میں نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے، جہاد کی کٹھن مہم میں
شاہ صاحب کے شریک رہیں گے۔ ۱۸۲۵ء میں سید صاحب اور شاہ صاحب
اس فیصلہ کن جہاد کی راہ پر چل پڑے، ان کی معیت میں سات ہزار سرفروش
مسلمان تھے . . . . ایسے سخت اور قوی دشمن کے مقابلہ پر جیسے سکھ تھے"
("مجدد الف ثانی سے سید احمد شہید تک" از محمد علی عثمانی)
(ماہنامہ ماہِ نو کراچی، خاص نمبر بیادگار تحریک آزادی ص ۱۴)

اس میں ایک وضاحت طلب بات یہ ہے کہ یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا جو مسلمانوں کو
نیست و نابود کرنا چاہتے تھے؛ تو سرحد کے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی خواہش میں اپنے "جہاد"
کا رخ انہوں نے ان کے خلاف کیوں کر نا چاہا۔ دوسرا سوال وہی ہے کہ آغاز میں جو سات ہزار
فوج تھی، اس سے انگریزوں نے تعرض کیوں نہیں کیا، کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ حکومتیں اپنے
مخالفوں کو مسلح فوج بنانے دیں؛ انہیں سہولتیں فراہم کریں خصوصاً انیسویں صدی کے آغاز میں
انگریز اس فوج سے صرفِ نظر کر سکتے تھے (اگر یہ خود ان کے ایماء پر نہ بنائی گئی ہوتی) ؎

تو لطفِ تماشا لیتا جا، مت ڈھونڈھ سراغِ اصلیت
"تصنیف" کے صورت خانے میں کچھ وہم کچھ سچائی ہے

سید صاحب خود وضاحت کرتے ہیں کہ ان کی لڑائی سکھوں کے خلاف ہے مگر آج کے
محققین سے تو یہ بھی بعید نہیں کہ وہ اسے سید صاحب کا خط ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

یا یہ موقف اختیار کریں کہ انہوں نے انگریز کے ڈر سے مصلحتاً جھوٹ بولا تھا یا یہ کہ ان الفاظ میں بین السطور یہی کہا گیا ہے کہ وہ انگریز کے مخالف تھے اور اسی سے لڑنا چاہتے تھے۔

"آپ کے ذہن و دماغ پر اس خاکسار کا معاملہ آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر و باہر ہے کہ میں قوم سکھ جیسے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے مامور ہوں اور فتح و نصرت کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

(مکتوب ۵۲ بنام فیض اللہ خاں مہمند مشیر و دبیر والیٔ پشاور)

(مکتوب سید احمد شہید، ص ۲۷۳)

وعدہ کس نے کیا تھا جو پورا نہیں ہوا، خدا کا وعدہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا اور یہاں "فتح و نصرت" تو دُور کی بات ہے، سید صاحب اور اسمٰعیل صاحب کی جانیں بھی گئیں۔ کہیں یہ وعدہ انگریز حکام نے تو نہیں کیا تھا جو ظاہر ہے کہ پورا نہیں ہوا، مگر انگریز کی حکومت تو مضبوط اور مستحکم ہو گئی ؎

میں اپنی بے خبری سے شکیب واقف ہوں
بتاؤ پیچ ہیں کتنے تمہاری پگڑی میں!

"امیر المومنین" صاحب کا اعلانِ عام ملاحظہ ہو، اس کے بعد کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ ان پر انگریز دشمنی کی تہمت لگائی جائے۔

اعلام از جانب امیر المومنین سید احمد صاحب میں ہے :

"نہ تو ہم کو مسلمان امراء میں سے کسی کے ساتھ کوئی تنازعہ ہے اور نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت ہے۔ ہمارا مقابلہ کفار لعینوں سے ہے نہ کہ مدعیانِ اسلام سے، بلکہ صرف لانبے بال والے سکھوں سے ہماری جنگ ہے۔ کلمہ گویوں اور اسلام کے طالبوں سے نہیں ہے اور نہ سرکارِ انگریزی سے ہم کو کوئی مخاصمت ہے اور نہ کوئی جھگڑا ہے، کیونکہ ہم تو اس کی رعایا ہیں، بلکہ

ہم کو تو اس کی حمایت میں رعایا کے مظالم کا استیصال کرنا ہے۔"
("مکتوباتِ سید احمد شہید" مترجم سخاوت مرزا، ص ۳۲)
(مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

دیکھ لیجیے، غلام رسول مہر اور دوسرے "متجددین تاریخ کے" امیرالمومنین"
وہ ہوتے ہیں، جو انگریز کی وفادار رعایا ہونے پر فخر کریں، اس کے مخالفوں سے لڑنے کو اپنی
زندگی کا مقصد جانیں:

"ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کا حال دیکھیں۔"

"حج کے بعد پھر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہو گیا، مگر اب کے اصل زور
جہاد و ہجرت پر تھا . . . . . اس وقت پنجاب سکھا شاہی کا زور تھا۔"
("ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" ص ۳۲)

اور یہی زور ختم کرنا مقصود تھا، اسی مقصد کے حصول کے لیے آپ کو "مامور"
کیا گیا تھا:

"سید صاحب کی دعوت کا اہم عنصر جہاد فی سبیل اللہ ہے اور یہی چیز
اس تحریکِ تجدید و جہاد کو نجد کی دعوتِ توحید سے خاص طور پر ممتاز کرتی ہے
سید صاحب کا کوئی وعظ یا مکتوب ترغیبِ جہاد سے خالی نہیں ہوتا۔ انہوں نے
صرف "وعظ" پر اکتفا نہیں کیا، اور اپنے مریدوں کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر
سرحد تشریف لے گئے۔" (ایضاً۔ ص ۴۰، ۳۹)

"پنجاب میں سکھوں کے ساتھ آپ نے کئی جہاد کیے، مگر بعض لوگوں
کی بے وفائی کی وجہ سے آپ اپنے پیر سید احمد شہید کے ہمراہ لڑتے
ہوئے ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ زخمِ تفنگ سے شہید ہوتے۔"
("تاریخ اہل حدیث"، از محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، ص ۴۱۴)

یہ بے وفا، وہی لوگ ہیں جن کو سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی ساری عمر منافق مشرک اور کافر قرار دیتے رہے جن کے عقائد سے "توحید" کو خطرہ لاحق رہا جو انگریز جیسے عادل حکمرانوں سے ساری عمر لڑتے رہے۔ اللہ اکبر!

اگر کوئی شخص یہ سوچتا ہو کہ شاید ان "مجاہدین" کی تیاریوں، ان کی فوج، ان کے نظام حکومت کا انگریز حکام کو علم نہیں تھا تو وہ اپنی غلط فہمی رفع کرلے۔ انگریز حکام کا کہنا تھا کہ ہم نے ان پر اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ ایسے میں جب انگریز ان مجاہدوں کی نقل و حمل سے پوری طرح واقف تھے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ یہ لوگ انگریزوں ہی کے ایما پر سکھوں اور مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے جارہے تھے، ورنہ حکام کسی طرح اس کی اجازت نہ دیتے اور پھر ان "مجاہدوں" کو انگریزوں نے جتنی سہولتیں راستے اور سرحد پہنچ کر بھی دی ہیں، ان کو بھی ذہن میں رکھیں، تو ہر بات واضح ہوجاتی ہے۔

"کچھ شیعہ صاحبان نے ایک فتنہ کھڑا کردیا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ چند سربرآوردہ شیعہ پٹنہ کے ایک انگریز افسر کے پاس گئے اور شکایت کی کہ سید صاحب جہاد کی نیت سے دورہ کررہے ہیں۔ انگریز افسر نے جواب دیا، یہ پادری صاحب جن کے متعلق یہ شیعہ حضرات الزام لگاتے ہیں، بہت دیندار حقانی شخص ہیں، کیونکہ جاسوس ان کے حل کی تلاش میں رہتے ہیں، ہم سے کسی نے یہ بات اب تک نہیں کی ہے۔"

("وقائع احمدی" قلمی نسخہ، ص ۶۹۷)

(بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد ۳، ص ۱۴)

اسی واقعے کو ابوالحسن علی ندوی ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

"عظیم آباد پٹنے کے بعض شیعہ صاحبان نے انگریز حاکم سے جاکر کہا کہ یہ سید صاحب جو یہاں اتنے آدمیوں کے ساتھ آتے ہیں، ہم نے سنا ہے

کہ ان کی نیت جہاد کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے جہاد کریں گے۔ حاکم نے اس کو تعصب اور حسد پر محمول کیا اور ان کو تنبیہ کی کہ آئندہ ایسی مفسدانہ بات نہ کی جائے۔"

("سیرت سید احمد شہید" حصہ اوّل، ص ۲۴۲)

یہ خود انگریزوں کی فرماں بردار رعایا ہونے کا اعلان کرتے ہیں، انگریز ان کے خلاف کسی ایسی تہمت کو برداشت نہیں کرتا، انگریز کے جاسوس ان کی ٹوہ میں رہتے تھے کہ یہ واقعی فرماں بردار ہیں یا اس فوج کو ہمارے خلاف کبھی استعمال کرنے کی خواہش تو ان کے سر میں پیدا نہیں ہوتی اور ان جاسوسوں کی رپورٹوں سے اتنے مطمئن ہیں کہ تعصب حسد اور مفسدانہ باتوں پر ان کے مخالفوں کو تنبیہ کرتے ہیں۔ ایسے میں آج کے لوگ ان "مجاہدین" کے خلاف یہ مفسدانہ بات کس طرح کرتے ہیں۔

سید احمد بریلوی کے سب سے بڑے سوانح نگار جعفر تھانیسری "سکھوں پر جہاد کا وعظ شروع ہونا" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"اس وقت ہر شہر و قصبہ و گاؤں برٹش انڈیا میں علانیہ سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ ہوتا تھا، مگر براہ دور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الٰہ آباد کے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی اس تیاری جہاد سکھوں کی اطلاع دی گئی، جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔"

("سوانح احمدی" ص ۷۰)

یعنی انگریز افسروں کی تحریری اجازت سے یہ "جہاد" کیا گیا۔ پھر یہ "جہاد فی سبیل اللہ" ہوا یا "جہاد فی سبیل انگریز"؟

جس غلام علی صاحب کا اوپر کے اقتباس میں ذکر ہوا ہے، ان پر "سربراہ مجاہدین" کو کس قدر اعتماد تھا اور وہ ان کی کتنی خدمت کرتے تھے، یہ بھی دیکھئے:

"یہ شیخ غلام علی وہ ہیں، جنہوں نے پورے بارہ روز تک قافلے کی پرتکلف ضیافت کی، بیش قیمت نذریں گزرانی اور بیٹوں، پوتوں اور مستورات اور اپنے عملے اور ملازمین کے ساتھ بیعت ہوتے۔"

("سیرت سید احمد شہید"، حصہ اوّل)

(از ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۲۲)

آپ "نذر و نیاز" کے ان مخالفین کے اس پہلو کی طرف توجہ نہ دیجئے۔ صرف سیاست کا حال دیکھئے۔

یہ بات صرف تھانیسری صاحب ہی نے نہیں کہی۔ شیخ محمد اکرام نے اپنی تصنیف "موج کوثر" کے صفحہ ۱۸ پر یہی واقعہ نقل کیا ہے اور "علماء ہند کا شاندار ماضی" جلد سوم ص ۹۸ پر یہی واقعہ نقل کرنے کے بعد سید محمد میاں لکھتے ہیں:

"بہرحال انگریزوں نے اس وقت سید صاحب کے اس علانیہ جہاد اور اس کی تیاری پر کوئی رکاوٹ نہیں کی۔"

سر سید احمد خاں بھی انگریزوں کے ساتھ سید احمد و اسماعیل کے رابطہ اور تعلق کی بات اسی لئے میں دہراتے ہیں اور سر سید احمد کی اس بات کو طفیل احمد منگلوری بھی اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں نقل کرتے ہیں:

"اس زمانے میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے، ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہوگیا تھا۔ جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو انہوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی۔"

گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنی چاہیے۔ دہلی کے ایک
مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا، تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی،
جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔"

(مضمون "سرسید احمد خاں، بجواب ڈاکٹر ہنٹر")

(مندرجہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۸، دسمبر ۱۸۷۱ء)

(بحوالہ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص ۱۱۲)

حکومت کو معلوم تھا کہ ان لوگوں کس خدمت پر مامور کیا گیا ہے، اس لیے انہیں کسی
تفتیش یا تحقیق کی ضرورت نہیں تھی، پس کمشنر اور مجسٹریٹ کو حکم دے دیا گیا کہ سامانِ جنگ اور
جہاد کے بارے میں ان "مجاہدوں" کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ اگر غلام رسول مہر حیران ہوں کہ
انگریزوں اور مجاہدوں کی ملی بھگت کی خبریں لوگوں تک کیسے پہنچ گئی ہیں، یہ تو راز ہائے
دُرونِ خانہ تھے ؎

سرِ خدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

تو اصل میں وہ اس حقیقت کو پیشِ نظر نہیں رکھ رہے کہ عشق و محبت کی باتیں کرنے والے
اس خوش گمانی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ ہم لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر یہ سب کچھ کر رہے
ہیں، مگر ؎

کھلنا کہیں چھپا بھی ہے چاہت کے پھول کا
لی گھر میں سانس اور گلی تک مہک گئی

آپ کے افعال و اعمال بلکہ حرکات و سکنات آپ کی اس "آلودگی" کی گواہی دیتے ہیں
آپ کی آنکھیں اور کبھی کبھی آپ کی زبان بھی اس راز کو طشت از بام کر دیتے ہیں ؎

رُسوائی کے ڈر سے کوئی رازِ محبت چھپتا ہے
آہیں رُو کیں، آنسو روکے، رنگ اگر اڑ جاتے تو

انگریز سرکار اس "تحریک مجاہدین" سے کیا چاہتی تھی (جو انہوں نے بڑی حد تک پورا کر دکھایا) ملاحظہ فرمائیے:

"اس سوانح اور نیز مکتوبات منسلکہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا سرکار انگریزی سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا، وہ اس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار انگریزی اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی، تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی، مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔" (سوانح احمدی، ص ۱۳۹)

ایک اور "تحقیق توڑ" اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ منشی جعفر تھانیسری اور طفیل منگلوری صاحبان انگریزوں اور مجاہدوں کے لازم و ملزوم ہونے کا اعلان کر رہے ہیں:

"جب تک اس تحریک کا تعلق انگریزی مقبوضات سے صرف اتنا رہا کہ رنگروٹ بھرتی کیے جائیں اور سرمایہ فراہم کیا جاتے تو انگریزی حکومت کے ذمہ داروں نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا، بلکہ انگریزوں نے اس کی حمایت کی، چنانچہ سید صاحب کے قافلہ کی دعوت کرنے والوں میں جہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام ہیں، وہاں ایک انگریز کا نام بھی ہے جس نے پورے قافلہ کے لیے کشتیوں پر کھانا پہنچایا تھا۔ جب حج کو جاتے ہوئے قافلہ قصبہ ڈلمئو سے الٰہ آباد کی طرف گنگا کے راستے سفر کر رہا تھا، کلکتہ میں مولانا محمد اسماعیل صاحب کے وعظ میں جہاں ہندو و مسلمانوں کا اجتماع ہوتا تھا، صاحبان اور ان کی میم صاحبان بھی شریک

ہوتی تھی۔" ("سوانح احمدی"، ص ۸۹)

(بحوالہ"عُلماء ہند کا شاندار ماضی"، جلد ۲، ص ۱۴۲)

اگر جعفر صاحب پسند نہ ہوں، تو مولوی عبدالرحیم صادق پوری سے حقیقتِ حال کے متعلق استفسار کر لیجئے ع

تمہارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

"منافقین ناہنجار اور کفارِ بدکردار نے حسد اور خوف سے حکومتِ برطانیہ کے عمال کو برانگیختہ کر دیا تاہم بنصرت اللہ العزیز وہ خائب و خاسر رہے۔ سید احمد صاحب کی برابر روش یہ رہی کہ ایک طرف لوگوں کو سکھوں کے مقابل آمادۂ جہاد کرتے اور دوسری جانب حکومتِ برطانیہ کی امن پسندی جتا کر لوگوں کو اس کے مقابلے سے روکتے تھے۔"

("الدر المنثور" از مولوی عبدالرحیم صادق پوری، ص ۱۳۵)

(بحوالہ"مقالاتِ سرسید" حصہ نہم، ص ۲۵۲)

اور ایک دفعہ پھر مولوی اسماعیل صاحب کی بڑائی کے بیچارک مزاحیرت کو سُنیے اور سر دُھنیے:

ضلع کے حکام چوکنے ہوتے اور انہیں خوف معلوم ہوا کہ کہیں ہماری سلطنت میں رخنہ نہ پڑے . . . . اس نظر سے ضلع کے حکام نے حکامِ اعلیٰ کو لکھا۔ وہاں سے صاف جواب آگیا۔ ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو۔ ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں . . . . . ." ("حیاتِ طیبہ" ص ۵۲۲)

"سیاسی مصلحتوں کی بنا پر سید صاحب نے یہ اعلان کیا کہ سرکارِ انگریزی سے ہمارا مقابلہ نہیں اور نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے۔ ہم صرف سکھوں

سے اپنے بھائیوں کا انتقام لیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ حکامِ انگلشیہ بالکل
باخبر نہ ہوئے اور نہ ان کی تیاری میں مانع آئے۔"

("حیاتِ طیبہ" ص ۲۹۰)

ان لوگوں نے صرف فوج ہی اکٹھی نہیں کی تھی، باقاعدہ ایک حکومت قائم کر رکھی تھی۔

"انہوں نے اپنے جاں نثار مریدوں کی ہمراہی میں ہمارے صوبہ جات
کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مرید بنایا اور ایک باقاعدہ گدی،
مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت قائم کر دی۔"

("ہندوستانی مسلمان اور ولیم ہنٹر")

(مترجم ڈاکٹر صادق حسین ص ۶۸)

"جملہ مسلمان جو اس جنگ میں موجود تھے، ان کی جمعیت ایک لاکھ
آدمی سے کم نہ تھی۔ ہتھیار اور سپاہی بھی سکھوں کے ہتھیار اور سپاہیوں کے
برابر ہی تھے، ان سے بُرے نہ تھے، مگر پٹھانوں کی دغا بازی نے قوم کا
ستیاناس کر دیا۔" ("الحیات بعد الممات" ص ۲۰۳)

"وہ دہلی سے آہستہ آہستہ کلکتے کی طرف روانہ ہوئے، پٹنہ میں
کافی عرصہ قیام رہا اور اس دوران میں تحریک کو ایک باقاعدہ حکومت کے
نمونے پر منظم کیا گیا۔ یعنی طور پر ملک کے چار حصوں کے لیے چار خلیفوں اور
ایک امام کا تقرر کیا گیا اور ہر ضلع میں ایک ایک گماشتہ مقرر کیا تاکہ وہ
مستقل افسروں کے ساتھ لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے کا بندوبست کرے"

("اسلامی ہند کا مغربی تہذیب کے خلاف ردِ عمل")

(از ڈاکٹر تصدق حسین خالد)

(کتاب "شاہ اسمٰعیل شہید" ص ۹۴)

آخر یہ لوگ کس کس کو جھوٹا قرار دے کر اپنی جان چھڑائیں گے۔ انتظام اللہ شہابی بھی انگریزوں کی مراعات کو تسلیم کرتے ہیں۔"

"مولانا محمد اسماعیل اور ان کے پیر مولوی سید احمد بریلوی نے دیکھا کہ سکھ جو مظالم مسلمانانِ پنجاب میں توڑ رہے ہیں، مگر اکبر شاہ ثانی اور نواب اودھ ٹکر ٹکر دیکھ رہے ہیں، انہیں اپنی عشرت اور عیاشی سے فرصت نہیں۔ ہر دو علمائے حق سر بکف خدا پر بھروسہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے...... جب لشکر اسلام تیار ہو گیا ۱۸۴۴ء میں روانگی عمل میں آئی۔ سید شہید نے جنوب سے پنجاب پر حملہ نہیں کیا کہ انگریزی تسلط یہاں تھا اور انگریزوں سے بھڑنا بھی مقصود نہ تھا۔ ادھر انگریز بھی مزاحم نہ تھے، بلکہ اخلاقی ایک گونہ مراعات روا رکھ رہے تھے۔"

("علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں")

(از مفتی انتظام اللہ شہابی)

اب ایک اور مسئلہ بھی حل ہوتا نظر آتا ہے کہ سکھوں کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے سرحد کو کیوں چنا گیا، اس لیے کہ انگریزی حکومت سکھوں سے معاہدہ کر چکی تھی اور اس معاہدے کا "مجاہدین" کو بہر حال پاس کرنا تھا۔ انگریز سکھوں پر حملہ کرانا چاہتا تھا، مگر اپنی سرحد سے نہیں؛ کیونکہ یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی:

"سید صاحب نے سکھوں کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے سرحد کی سنگلاخ سرزمین کو اس لیے ترجیح دی تھی کہ یہ علاقہ مجاہدین کے لیے نسبتاً محفوظ تھا؛ دوسرے یہاں کے باشندوں کی حمیت ملی مسلم تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریزی حکومت سکھوں سے معاہدہ کر چکی تھی، جس کے باعث انگریزی سرحد سے سکھ سلطنت پر حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

("شہدائے بالاکوٹ" از محمد عارف)

("ماہِ نو کراچی خاص نمبر بیادگار تحریک آزادی، ص ۳۰)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"مسلمانان سرحد و پنجاب پر سکھوں نے اپنے زمانۂ عروج میں جو مظالم کیے تھے ان سے متاثر ہو کر مولانا سید احمد بریلوی اور ان کے خلیفہ مولوی محمد اسمٰعیل نے ۱۸۲۴ء میں جو سلسلۂ جہاد شروع کیا تھا، وہ ۱۸۴۷ء تک جاری تھا تآنکہ انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا۔"

("انیسویں صدی کا افسانۂ تباہی" از محمد امین زبیری)
("ماہِ نو" کراچی، خاص نمبر بیادگار تحریک آزادی ص ۲۵)

سکھوں سے ان کی لڑائی اس لیے تھی کہ یہ علاقہ انگریزی سلطنت میں شامل ہو جائے جب یہ ہو گیا تو ان کا کام ختم ہو گیا، اس سب کچھ کے بعد اگر پروفیسر محمد ایوب قادری کہیں کہ سکھوں کے علاقے پر انگریز کا تسلط قائم کروانے کے بعد یہ "مجاہد" انگریز سے لڑنا چاہتے تھے، تو آپ کیا کہیں۔ گے؟ مجھے علم نہیں، مگر میں کہتا ہوں ؎

نظریں کہیں ہیں، ہاتھ کہیں، سوچ کے
اس بے توجہی سے تو پتھر نہ ماریئے

"ظاہر ہے کہ پنجاب کے انگریزوں کے قبضہ میں آجانے کے بعد مجاہدین کا مقابلہ براہِ راست انگریز سے تھا۔"

(مقدمہ "حیات سید احمد شہید")
(از پروفیسر محمد ایوب قادری، ص ۲۴)

کہاں سے ظاہر ہے؟ کس بات سے ظاہر ہے، سید احمد خود کہتے ہیں کہ ہم انگریزوں کے خدام بے دام ہیں، ان کے متبعین ساتھی، ان کے ابوبکر و عمر (نعوذ باللہ) دہائی دیتے ہیں کہ ہمارا انگریز سے کوئی جھگڑا نہیں۔ سرحد کے مسلمان ان کو ان تمام حالات کی بنا پر انگریز کا جاسوس سمجھتے ہیں اور اسی یقین کے باعث مار ڈالتے ہیں، وہ انگریزوں کا مال کھاتے

پاکستان کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے حوالے سے بات کرتے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے انگریز نے مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کی طاقت ختم کی۔ پھر سکھوں کا زور توڑا اور آخر میں مغل شاہنشاہیت پر ضربِ کاری لگا دی اور ظاہر ہے کہ سکھوں کا زور توڑنے کا کام انہوں نے اپنے معتمدین خاص سیدا حمد بریلوی اور اسماعیل صاحبان سے لیا؛

"جنوب میں مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کی طاقت فنا ہو چکی تھی، ادھر شمال میں سکھوں کا زور ٹوٹ چکا تھا، لے دے کے یہ مغل شاہنشاہیت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ باقی تھا جس کی موجودگی برطانوی اقتدار کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔"

("بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ" از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی)

(کتاب "۱۸۵۷ء، کوائف وصحائف" ص ۵۵)

اب ذرا اس طرف بھی توجہ دیجئے کہ اسماعیل دہلوی صاحب نے مسلمانوں کو کافر و مشرک قرار دینے کا کارنامہ کس لیے انجام دیا اور پھر ان لوگوں نے بقول ان کے "منافق مسلمانوں" کے خلاف "جہاد" کیوں کیا، صرف اس لیے کہ انگریز مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھنا چاہتا تھا۔ سرجان میلکم نے لکھا؛

"ہماری حکومت کی حفاظت اس پر منحصر ہے کہ جو بڑی جماعتیں ہیں ان کو تقسیم کر کے ہر جماعت کو مختلف طبقوں اور فرقوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تاکہ وہ جدا رہیں اور ہماری حکومت کو متزلزل نہ کر سکیں۔"

(مضمون "برصغیر کے اسلامی مدارس")

(از شمس الحق افغانی)

(ماہنامہ "البلاغ" کراچی، فروری ۱۹۶۹ء)

میں۔ انگریز انہیں ہنڈیاں پہنچاتے ہیں۔ ان کے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں وہ انگریز کے حریف سکھوں سے جنگ لڑتے ہیں۔ وہ ان مسلمانوں کے خلاف "جہاد" کرتے ہیں جن سے انگریز کو خطرہ تھا، جن کے بارے میں انگریز کو یقین تھا کہ ان میں عشقِ رسول کا جذبہ موجود ہے۔ یہ دینی معتقدات کے سختی سے پابند ہیں۔ رسول کو "اپنے جیسا بشر" نہیں سمجھتے۔ پھر یہ کہاں سے ظاہر ہوا کہ مستقبل قریب میں "مجاہدین" کا مقابلہ براہ راست انگریز سے تھا۔

ع تشنہ کاموں کو سرابوں کا چکا چوند نہ دے

ایک اور آواز سماعت فرمایئے:

"علاقہ سرحد میں مولانا مولوی سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید نے انگریزوں کے خلاف وہ آگ بھڑکا دی تھی، جو بجھنے میں نہ آئی۔"

(ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء)

(از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۱۰)

کہیں سے کوئی ایک دلیل! کوئی ثبوت! کوئی اشارہ! جس سے انگریزوں کے خلاف آگ آخر بھڑک کیسے اٹھی؟ یہ چنگاری آپ کے ذہن میں کیسے بھڑکی جس سے نہ بجھنے والی آگ پیدا ہوئی ہے، کچھ ہمیں بھی تو بتایئے۔ یا ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ مفتی کہلاتے ہیں، فتویٰ دے رہے ہیں، سبحان اللہ! ؎

بگو حدیثِ وفا، از تو باور است بگو!
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند است

O

سرحد کے مسلمانوں
کے خلاف
جہاد

خانۂ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

کچھ لوگ انگریزوں کے خلاف کوئی بات کرنا خلافِ مصلحت سمجھتے رہے۔ ان سے ارادت اور ان کی اطاعت پر افتخار وابتہاج ظاہر کرتے رہے۔ ان کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتے رہے۔ یہ حضرات جب بالاکوٹ پہنچے، جہاں پہنچنے کے لیے انہوں نے "قرعہ فال" نکالا تھا، تو موت نے ان کا استقبال کیا۔

ان لوگوں نے پکے سچے مسلمانوں کو مشرک اور کافر قرار دیا۔ ان کو مفسد اور مخالف کہہ کر اپنی ساری علمیت ان کے قتل کا جواز پیدا کرنے کے لیے انہیں مرتد ثابت کرنے اور ان کے اموال اور جائیدادوں کو مالِ غنیمت قرار دینے پر صرف کر دی۔

سید احمد اور اسماعیل دہلوی صاحبان ان غیر وہابی مسلمانوں کو اہلِ کتاب کافروں میں شمار کرتے ہیں، مگر نصاریٰ بھی تو اہلِ کتاب ہیں، جن سے ان کے مراسم برخورداری قائم رہے۔ صرف اس لیے کہ وہ صاحبانِ بست وکشاد تھے۔ یہ لوگ انگریزوں سے جنگ کے تصور کی مخالفت کرتے رہے، مگر اہلِ سنت و جماعت مسلمانوں کے قتل وخون کے جواز کی صورتیں نکالتے رہے:

"یہاں دو معاملے در پیش ہیں، ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل وخون کے جواز کی صورت نکالنا اور ان کے اموال کو جائز

قرار دینا، اس بات سے قطع نظر کہ وہ ان کے ارتداد پر یا ان کی بغاوت پر مبنی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا آیا کوئی سبب ہے یا کچھ اور ہے جبکہ بعض اشخاص کے مقابلے میں ان کا مرتد ہونا ثابت ہو چکا ہے اور بعض کے متعلق بغاوت یا اس کا کوئی اور سبب ہے اگرچہ پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے کیونکہ ہم ان فتنہ پردازوں کو فی الحقیقت مرتدوں، بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور ان کو اہل کتاب کافروں کے مثل جانتے ہیں"

(مکتوب مولوی محمد اسماعیل بنام سید احمد)

(مکتوبات سید احمد شہید" ص ۱۴۲)

انگریزوں کی مخالف طاقت جانباز سرحدی مسلمان تھے، ان کو بدکردار منافق کہہ کر "تحریک مجاہدین" کے سربراہوں نے ان کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے ان پر چڑھائی کی، خدا نے ان کو اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ آج کے "دانشور" ان کی سکھوں کے ساتھ لڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کی غداری کا رونا روتے ہیں، لیکن اصرار کرتے ہیں کہ ان مجاہدوں کی کوئی لڑائی مسلمانوں سے نہیں ہوئی سب سکھوں ہی سے ہوئی ہیں۔ سید احمد بریلوی صاحب خود مسلمانوں کو مرتد ثابت کرنے، ان کے خلاف خونریزی کا جواز پیدا کرنے اور ان کا مال ہضم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اس گندگی کو پاک کرنے کے ارادے رکھتے ہیں۔ ان "اقوال وارشادات" کو کوئی کہاں تک چھپا سکتا ہے:

"منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم "مقدمۃ الواجب" ایک واجب معاملہ ہے اس لیے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قرب وجوار سے بدکردار منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجتار تک پہنچ گیا ہے"

(مکتوب بنام سردار میر عالم خاں باجوڑی)

("مکتوبات سید احمد شہید" ص ۱۲۵)

منشی محمد حسین محمود تیس قصبہ نہٹور ضلع بجنور کی کتاب "فریادِ مسلمین" مطبع ریاض ہند امرتسر میں چھپی تھی، اس کا ایک نسخہ لاہور کی ایک لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں مصنف نے سید احمد بریلوی کے اعلانِ تکفیر کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ پنجاب کے امیر اور علماء ان کی ان حرکتوں سے سخت ناراض ہوتے اور سمجھ گئے کہ یہ جعلی پیر ہیں اور اصلی وہابی، اس لیے ان سے بیعت روا نہیں ہے:

"جب کوئی امیر مسلمان اور عالم پنجاب کا ان کی طرف متوجہ نہ ہوا، جب انہوں نے ان کی تکفیر کا فتویٰ جاری کیا۔ اس فتویٰ تکفیر کے اجراء سے تمام ملک پنجاب کے امیر اور علماء ناراض ہو گئے اور جواب لکھے کہ تم وہابی مذہب ہو، تم سے بیعت کرنا روا نہیں۔" (فریادِ مسلمین، ص ۹۸)

وہابی خود مانتے ہیں کہ پنجاب والے خصوصاً ان کے معتقدات سے نفرت کرتے تھے اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے ایسے ہی عقیدوں کو رواج دیا تھا، جن سے اسلامیوں میں پھوٹ پڑے اور انگریزی حکومت مضبوط ہو، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کم ہو، اور مسلمان کمزور ہوں گے۔

سراپا فتنہ زجاتیست کہ من می دانم

ان معتقدات کے مخالفوں کے خلاف انہوں نے فوج کشی کی اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کی سعی کی۔ انگریزوں نے شاید اس مقصد کی تکمیل کے لیے بھی اپنے مقبوضہ علاقے میں شورش کو مناسب نہیں سمجھا اور انہیں سرحد جانے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اس تحریک کو دوہرے فائدے کے لیے جنم دیا کہ ایک تو سکھ جو انگریزوں کے لیے مصیبت ہوں کمزور ہوں، دوسرے مسلمان اس سازش کے نتیجے کے طور پر اس قابل نہ رہیں کہ کبھی انگریزوں کے مقابلے میں کھڑے ہو سکیں، خصوصاً سرحد کے مسلمان جو ہمیشہ انگریزوں کو پریشان کرتے رہنے کی صلاحیتوں اور اہلیتوں سے مالا مال تھے۔

" وہابی ایک فرقہ ایسے اشخاص کا ہے کہ وہ اس طریقہ اسلام سے عموماً
پنجاب میں رائج ہے، اتفاقِ کلی نہیں کرتے۔"

(ترجمانِ وہابیہ، ص ۴۶)

وہابیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی دستبرد سے کوئی بزرگ نہیں بچا، جن لوگوں نے حبیبِ کبریا، احمدِ مجتبےٰ، محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کی عزت وتکریم اور عقیدت و تعظیم کے خلاف ژاژخائی کی ہو، ان کے نزدیک بزرگانِ دین کیا اہمیت رکھتے ہیں۔

" جب اختلاف مذہبی میں بحث شروع کی تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے لے کر جس قدر امام اور اولیاء اللہ خاندان قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ وغیرہ میں گزرے ہیں ان کو ملحد اور مشرک اور بدعتی آمین بالجہر کی طرح پکار کر کہنا شروع کر دیا۔" (فریادِ مسلمین، ص ۱۱۳)

" تاریخ تناولیاں" سید مراد علی گڑھی (منشی سرحد چوکی دربند ضلع ہزارہ) کی تصنیف ہے اور "مجاہدین" کی جنگ کے بارے میں لائق اعتماد ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سردار پائندہ خاں کے خلاف سید احمد اور اسماعیل صاحبان نے بیعت نہ کرنے اور انہیں خلیفہ تسلیم نہ کرنے کی بناء پر فتویٰ کفر دیا اور اس کے خلاف "جہاد" کیا۔ یہاں علامہ فضلِ حق خیر آبادی سے ان حضرات کا تقابل کریں، تو عجیب صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ فضلِ حق خیر آبادی انگریز غاصبوں کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور اسمٰعیل و سید احمد صاحبان حنفی مسلمانوں کے خلاف ؎

ببیں تفاوتِ رہ، از کجاست تا بہ کجا

"تاریخ تناولیاں" کے تعارف میں محمد عبدالقیوم جلوال (تناولی) لکھتے ہیں:

" اس کتاب کے مطالعے سے جہاں تناولی قوم کے مجاہدانہ کارناموں اور اسلام کے لیے جاں نثاری اور قربانی کے حیرت انگیز واقعات کا علم ہوگا وہاں

بہت سے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوگا، جن کو چھپانے کے لیے بہت سے لوگوں نے دیانت کو قربان کر دیا۔ تناولی قوم کے عظیم فرزند سردار پائندہ خاں نے ہری سنگھ اور دیوان سنگھ کو پے درپے شکست دے کر رنجیت سنگھ کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔

۱۸۳۰ء میں سید احمد بریلوی اور محمد اسمٰعیل دہلوی نے پشاور مردان اور سوات کی مسلم آبادی کو بزورِ شمشیر محکوم بنا کر سردار پائندہ خاں کو پیغام بھجوائے اور خود مل کر بھی بیعت کی دعوت دی۔ جب وہ بیعت پر تیار نہ ہوا، تو سید صاحب نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا کر چڑھائی کر دی، چونکہ سردار مذکور کی تمام تر توجہ سکھوں کی طرف تھی اور وہ ذہنی طور پر اس نئی جنگ کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے اسے شکست کھا کر علاقہ خالی کرنا پڑا۔ اس نے شکست کا بدلہ لینے کے لیے دوبارہ صف بندی کی اور بیٹا یرغمال رکھ کر سکھوں سے مدد لے کر سید صاحب کے لشکر پر حملہ کر دیا اور انہیں علاقہ چھوڑ کر بالاکوٹ کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔"

(تعارف "تاریخ تناولیاں")

(از محمد عبدالقیوم جلوال (تناولی) ص ۲)

کتاب کے مصنف اس جنگ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

" جنگ خلیفہ سید احمد بریلوی ملقب بہ سید بادشاہ و مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ہمراہ سردار پائندہ خاں۔

راویانِ معتبر بچشم دیدہ نقل کرتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء میں خلیفہ سید احمد سرگروہ وہابیاں نے یار محمد خاں حاکم پشاور و کوہاٹ برادر دوست محمد خاں والئ کابل کو بہ پشت گرمی لشکر غازیاں شکست دی اور ملک پشاور و کوہاٹ پر

قبضہ کر کے اپنے تھانہ جات مقرر کیے اور بہ لقبِ سید بادشاہ مشہور ہوا . . . .
سردار پائندہ خاں نے خلیفہ کی بیعت نہ کی، لہٰذا خلیفہ جانب پائندہ خاں سے
بدگمان تھا۔ آخر بہ نظرِ مصلحت خلیفہ موصوف مع مولوی اسمٰعیل مقام موضع
عشراہ پائندہ خاں سے ملاقاتی ہوا اور وقتِ ملاقات خلیفہ نے کمال چرب زبانی
و شیریں بیانی سے قصۂ بیعت کا چھیڑا، مگر سردار موصوف نے سوائے لیت و لعل
جواب صاف نہ دیا . . . . . القصہ پھر تو خلیفہ نے نسبت پائندہ خاں فتویٰ
کفر کا دے کر مع مولوی محمد اسماعیل و لشکر غازیان برہمونی سربلند خاں و مدد خان
عزمِ جنگ پائندہ خاں پر مستعد ہوا۔“

(”تاریخ تناولیاں“ از سید مراد علی، علیگڑھی)

(مطبوعہ مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور)

ان مجاہدوں کی نبوت کا دعویٰ تو تشنۂ تکمیل ہی رہ گیا تھا، ”امامت“ ہی سے کام
لینا پڑا۔ غلام رسول مہر ”امامت“ کے منکروں کو اسمٰعیل دہلوی کے واجب القتل اور باغی
قرار دینے کا ذکر فرماتے ہیں اور اس مسلمان کے خون کو جو اطاعت خدا و رسول کرے، مگر
اطاعتِ سید احمد نہ کرے، کفار کے خون کے مانند قرار دیا جاتا ہے اور اعتراض کرنے والوں
کا جواب بھی ”جہاد“ بتایا جاتا ہے۔ ”جہاد“ نہ ہوا، امرت دھارا ہو گیا کہ ان پر ہر تکلیف کا علاج
اسی کے ذریعے ہو گا ؎

یکے دو است بدار الشفائے میکدہ ہا
بہر مرض کہ بنالد کسے، شراب دہند

”امامت کا کام پورا ہو گیا، تو شاہ صاحب نے منکرینِ امامت کو باغی
اور واجب القتل قرار دیا۔“

(”سید احمد شہید“ از غلام رسول مہر، جلد ۱، ص ۹۲)

"آپ (سید احمد) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوئی جو آپ کی
امامت کو سرے سے تسلیم نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کردے وہ باغی مستحل
الدم ہے اور اس کا قتل کفّار کے قتل کی طرح خدا کی عین مرضی ہے.....
معترضین کے اعتراضات کا جواب تلوار ہے نہ کہ تحریر و تقریر"

("سیرت سیّد احمد شہید" ص ۴۸۵)

یہ فلسفۂ جہاد اور نکتۂ امامت انگریز کی خوشنودی کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ دین
کی سربلندی اور ملت کی سرفرازی کے لیے نہیں ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

ان "مجاہدین" کی شریعت انگریز کی خوشنودی سے عبارت تھی، لیکن ظاہر ہے کہ انگریز حکمرانوں
کے لیے سب کچھ کرتے ہوئے اگر اپنے لیے بھی کچھ کر لیتے، تو کیا حرج تھا؛ چنانچہ انہوں نے سرحدیوں
کی لڑکیوں کے نکاح اپنے ساتھ ضروری قرار دیئے اور اس "بطریق احسن" عمل درآمد شروع کر دیا،
مگر بعض لوگوں نے اس زبردستی کو پسند نہ کیا اور لڑائی ہوئی "صاحبانِ شریعت" (العیاذ باللہ)
مارے گئے ؎

ڈالی نظر ندی پہ تو بے موج، بے خروش
رکھا قدم تو گردشِ گرداب سامنے

یہ ہے ان لوگوں کے سارے جہاد کی تلخیص،

"خلیفہ صاحب نے شرعی حکومت کے زور سے ان (جرگہ یوسف زئی)
کی لڑکیوں کا نکاح حکماً کرانا چاہا، بلکہ دس بیس لڑکیوں کے نکاح مجاہدین وغیرہ
سے کرا دیئے اور خود بھی رضامندی سردارانِ جرگہ، اپنے دو نکاح کیے، مگر وہ
جرگہ زبردستی ان سے سرکش ہو گیا اور بہت مدت تک ان پر جہاد ہوتا رہا"

بہت کچھ جدال و قتال کی نوبت پہنچی، مگر وہ ان سے مغلوب نہ ہوا۔ ایک روز بہت سے ملکی جمع کر کے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب خود ان کے مقابلے کو گئے، لڑائی شروع ہوتے ہی مولوی صاحب کی پیشانی پر گولی لگی، شہید ہو گئے۔"

"کار ما آخر شد، آخر زما کارے نہ شد"

("فریادِ مسلمین"، ص ۱۰۲)

"فریادِ مسلمین" کا مصنف بہر حال سُنّی مسلمان ہے اور ظاہر ہے کہ جھوٹ بولنا اہل سنت کا کام نہیں ہے، لیکن اگر جھوٹ کے خوگر اس بات کو نہ مانتے کا ذرا سا ارادہ بھی ظاہر کریں، تو میں عرض کروں گا کہ یہی حقیقت اسمٰعیل دہلوی کے عاشقِ زار مرزا حیرت دہلوی کے قلم سے بھی نکل گئی ہے، ملاحظہ کیجئے:

"ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی تھی کہ میرا نکاح ثانی ہو مگر مجاہد صاحب زور دے رہے ہیں "نہیں، ہونا چاہیئے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالۂ مجاہد کرتے تھے، اس کے سوا ان کو کچھ چارہ نہ تھا"

("حیاتِ طیبہ" ص ۳۵۶)

زبردستی شادیاں رچانے کے جہاد میں مصروف ہوئے تو "مجاہدین" کو نہ "تقویۃ الایمان" کی تبلیغ یاد رہی نہ "جہاد" کے مقصدِ اصلی کو کوئی زک پہنچی، نہ کوئی "الہام" پردۂ احساس پر ضوفگن ہوا، نہ "فتح و نصرت کی بشارتیں" ان کا کچھ بگاڑ سکیں ؎

خمارِ بادہ در توبہ و دلِ ساقی
بیک تبسم مینا شکست و لبست و کشاد

ان ظالمانہ واقعات کے پس منظر میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا ذہن کام کر رہا تھا، چنانچہ وہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خوف سے بے نیاز نکاح بیوگان کے متعلق صاف لکھ گئے:

"اگر اس کے خویشوں میں یہ صورت پیدا ہو جاتے، تو خواہ مخواہ دوسرا نکاح کرا دیوے۔" (صراطِ مستقیم ص ۱۷، در طبع مطبع احمدی، لاہور)

جو شریف آدمی اپنی بچیاں جبراً ان کے نکاح میں دینے سے انکار کرتے تھے اور صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ ان "منافقوں" اور "فسادیوں" کے خلاف سید احمد صاحب کو بقول خود غیب سے مامور کیا گیا، ان کی گوشمالی کے لیے انہوں نے جہاد کو ضروری قرار دیا۔

اہلِ حدیث کے بہت بڑے رہنما اور ادیب مولوی محمد علی قصوری ایم اے کیمبنٹ نے اپنی کتاب "مشاہداتِ کابل و یاغستان" شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۷) میں "جماعت مجاہدین" کی جو اخلاقی حالت بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود، دیوار کج

(جماعت کے امیر نعمت اللہ) عورتوں کے بے حد شوقین تھے، تین چار کی نکاحتاً بیویاں تھیں اور دس بارہ نہایت خوبصورت لڑکیاں بطورِ خادماؤں کے رکھتے تھے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی طرح، امیر نعمت اللہ کا بھی زیادہ وقت انہی نوجوان لڑکیوں سے لہو و لعب میں گزرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۱۰۰)

کسی شخص کو بیت المال کے متعلق امیر صاحب سے سوال کرنے کا حق نہ تھا۔ میں نے سنا کہ بعض گستاخوں نے بیت المال کے متعلق سوال کرنے کی جسارت کی، اگر اس کا جواب یہ ملا کہ رات کو چپکے سے امیر صاحب کے معتمد انہیں ختم کر دیتے تھے اور پھر اس کا ذکر بھی کوئی شخص نہیں کر سکتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۱۰۹)

"امیر صاحب کی خادماؤں میں کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اس کے بچے کو پیدائش کے بعد گلا گھونٹ کر چپکے سے دریا برد کر دینا امیر صاحب کی عادت تھی کہ ان خادماؤں کو اکثر بدلتے رہتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۱۱۱)

"رحمت اللہ بھی اپنے بھائی کی طرح بہت بدچلن اور آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اگرامیر نعمت اللہ کو لڑکیوں کی رغبت نے معطل کر رکھا تھا، تو انہیں نوجوان لڑکوں کی محبت نے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر رکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۱۱۰)

"امیر نعمت اللہ کی اولاد نرینہ میں سے سب سے بڑا لڑکا برکت اللہ تھا جو غالباً اس وقت نو سال کا تھا۔ لڑکا خاصا خوبصورت اور بگڑا ہوا صاحبزادہ تھا۔ ہر وقت دو تین اوباش نوجوان اس کی مصاحبت میں رہتے اس لیے اس کا آوارہ ہونا لابدی تھا ۔ ۔ ۔ ۔"

("مشاہداتِ کابل و یاغستان")

(از مولوی محمد علی قصوری ایم اے کیمبنٹ، ص ۱۱۱)

خاص قسم کے اہل قلم کہتے ہیں کہ یہ لوگ سکھوں سے لڑنے آتے تھے۔ جب کوئی ان سے پوچھے کہ سکھوں سے جنگ کرنی تھی تو پنجاب جاتے، سرحد میں کیا لینے آتے تھے تو فرماتے ہیں کہ اس مضبوط قلعے سے ساری دُنیا ہی فتح کی جاسکتی تھی۔ بالاکوٹ ایسی ہی جگہ ہے، مگر اس مسئلے کو خود سید احمد صاحب نے حل کر دیا ہے۔ شاہزادہ کامران کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ پہلے جہاد ان مسلمانوں کے خلاف کیا جائے گا اور یہاں سے فراغت کے بعد پنجاب کے سکھوں سے بات ہوگی، دیکھ لیجئے :

"اس عاجز کو جہاد کے اجراء اور کفر و فساد کے ازالے کے لیے غیب سے مامور کیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ منافقوں اور فساد برپا کرنے والوں نے سرکش کفار کی حمایت پر کمر باندھ لی ہے اور مجاہدین سے دشمنی برت رہے ہیں اس لیے ان کی گوشمالی اور کفر و فساد کے خلاف جہاد کی مہم کا چلانا ضروری ہے اسی بنا پر میں نے تمام مجاہدین کو منافقین کو کیفر کردار تک پہنچانے کی ترغیب دی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد یہ عاجز اپنے سچے اور مخلص مجاہدین کے ساتھ لاہور کی طرف کفر اور

سرکشی کے ازالے کے لیے روانہ ہو جائے گا، کیونکہ اصل مقصد پنجاب کے سکھوں سے جہاد کرنا ہے۔" (مکتوباتِ سید احمد شہید، ص ۵۷، ۵۶)

اور یہ بات ایک جگہ نہیں کہی، ان "امیر المومنین" نے کئی مقامات پر دہرائی ہے خان خاناں خلجائی رئیس قلات کے نام ایک مکتوب میں رقم فرماتے ہیں:

"نہایت مناسب اور مصلحت یہ ہے کہ ایسا کیا جائے کہ سب سے پہلے تو منافقوں کے استیصال کے متعلق انتہائی کوشش کی جائے اور جب جناب والا کے قرب و جوار کے علاقہ میں ان بدکردار منافقین کا قصہ پاک ہو جائے تو پھر اطمینانِ خاطر اور دلجمعی کے ساتھ اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، اس لیے مصلحتِ وقت یہی ہے کہ پہلے تو منافقین کے فتنہ و فساد کے دفعیہ کے لیے سخت کوشش فرمائیں۔"

(مکتوباتِ سید احمد شہید، ص ۷۴)

انہوں نے جہاد کو جس طرح مذاق سمجھ رکھا تھا، وہ تو اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ وہ کسی کی طرف سے اس خدمت پر مامور تھے۔ جہاد ایسا معاملہ تو نہیں ہے کہ آپ اسے قرولی کی طرح ہر شخص کے جھونک دینے کا ڈرا وا دیتے رہیں، مگر ان صاحبوں نے کثرتِ استعمال سے اس قرولی کو کُند کر ڈالا تھا۔ اگر کسی سے بحث میں ہار جاتے، تو بھی یہی ارشاد ہوتا کہ فلاں کام کر لوں، تو اس مولوی کے خلاف بھی جہاد کروں گا — آخر متخصصین فی الجہاد تھے:

"مولوی اسمٰعیل صاحب بحث مباحثہ کے ارادے سے ان (مولانا عبدالرحمٰن ولایتی) صوفی لقب سے ملنے گئے، مگر کہتے ہیں کہ صوفی صاحب کا تصرف غالب رہا۔ بحث شروع کرنے سے باز رہے۔ رخصت کے وقت مولوی اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ فرنگی محل کے مولوی بہت گمراہ ہیں، میرا ارادہ ہے کہ جس وقت کلکتہ سے واپس ہوں گا، ان گمراہوں پر جہاد کروں گا۔" (فریادِ مسلمین، ص ۹۵)

اگر فرنگی محلیوں کے معاملے میں اسمٰعیل دہلوی کی رگِ جہاد بھڑکی تھی تو شاہ نصیر بھی باقاعدہ چڑھ دوڑے تھے۔

"شاہ نصیر نامی حنفی چشتی جو ان دنوں میں ایک شاعر تھے انہوں نے مولوی اسمٰعیل صاحب کے جہاد کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا، اس میں دو شعر ہجو ملیح میں لکھے ہیں "تذکرۂ آب حیات" کے مصنف مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے یہ دو شعر انتخاب کر کے شاعرِ مذکور کی یادگار لکھے ہیں جن کی میں نقل کرتا ہوں ؎

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو، نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے
اگرچہ تھے دمِ شملہ سے یہ شیر نیستانی

یہ چھیڑ ان کو ناگوار ہوئی، شاہ نصیر کے مکان پر حملہ کر کے چڑھ گئے۔"

("فریادِ مسلمین"، ص ۱۱۱، ۱۱۰)

جناب یوسف جبریل جن کا کہنا ہے کہ میرے جدِّ امجد سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے، نادانستگی میں اس مفروضے کی تردید فرما گئے کہ اسمٰعیل دہلوی سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے ؎

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا

"اسماعیل شہید جیسے لوگ سر سے کفن باندھ کر لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آتے اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی سے شہید ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔" (مضمون "المیۂ سپانیہ کے عوامل" از یوسف جبریل)

(روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۲۵ اگست ۱۹۷۴ء)

ان لوگوں کے "محتاط الفاظ" کے بین السطور اس حقیقت کو تلاش کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں کون کون شامل تھے؟

"۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہید اور ان کے ساتھی شہید کر دیئے گئے اور خود آزاد قبائل میں سے بعض لوگوں نے ہندوستانی مجاہدین کو لُوٹا کھسوٹا اور قتل تک کیا۔"

(مقدمہ "کابل میں سات سال" از عبیداللہ سندھی ص ۱۶)

سر سید احمد خاں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے دھوکے کا ذکر تو کرتے ہیں مگر ان کی "مجاہدوں" سے مخالفت کو دغا قرار دیتے ہوتے یہ حقیقت بہر حال تسلیم کرتے ہیں کہ "سمعیل و سید احمد کی شہادت" مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوئی:

"ہندوستان کے گوشہ شمال و مغرب کی سرحد پر جو پہاڑی قومیں بستی ہیں وہ سُنی المذہب حنفی قومیں ہیں ۔۔۔۔ چونکہ پہاڑی قومیں ان (سید احمد و اسماعیل دہلوی) کے عقائد کے مخالف تھیں، اس لیے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے، مگر البتہ چونکہ وہ سکھوں کے جور و ستم سے نہایت تنگ تھے۔ اس سبب سے وہابیوں کے اس منصوبے میں بھی شریک ہوئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جاتے ۔۔۔۔۔۔ لیکن چونکہ یہ قوم مذہبی مخالفت میں نہایت سخت ہے۔ اس سبب سے اس قوم نے اخیر میں وہابیوں سے دغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا اور مولوی محمد اسمعیل صاحب و سید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔"

("مقالاتِ سر سید"، حصہ نہم، ص ۱۳۸، ۱۳۹)

"علماء ہند کا شاندار ماضی" کے مصنف اسماعیل و سید احمد کی "مسلمانوں کے ہاتھوں شہادت" نہیں مانتے، مگر ان کے بہتیرے ساتھیوں کے اسی انجام کی دہائی دیتے ہیں:

"خود مسلمانوں کے ہاتھوں سید صاحب کے غازیوں کے بڑے حصّہ کو ایک رات میں ذبح کروایا۔"

("علماء ہند کا شاندار ماضی"، جلد دوم ص ۲۴۵)

فضل حسین بہاری صاحب جو وہابیوں کے بہت بڑے نمائندے ہیں، سیّد نذیر حسین دہلوی کی سوانح حیات میں حسب روایت محتاط زبان میں ان حضرات کے مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچنے کی بات کرتے ہیں ؎

نیرو تے عشق ہیں کہ دریں دشتِ بیکراں
گامے نہ رفتہ ایم و بیاباں رسیدہ ایم

"جب سکھوں نے دیکھا کہ عنقریب مسلمان تمام پنجاب پر قابض ہو جائیں گے، تو انہوں نے اپنے کو (جن کی تعداد معتدبہ تھی) گانٹھا اور اس بے وفا قوم نے عین حالتِ جنگ میں بے وفائی کی جس سے مسلمانوں کو شکست ہوئی، اور مولانا شہید اپنے سردار اور ہمراہیوں سمیت ۲۴ ذی القعدہ ۱۲۴۶ھ کو ترتین سال کی عمر میں شہید ہوئے۔"

("الحیات بعد الممات" ص ۲۰۴)

حقائق کا اخفاء

بدل چکے ہیں بہت خوشنوائی کے معیار
خدا چمن میں کسی کی زباں نہ کھلوائے

جب کسی افسانے کی اساس ہی صداقت دشمنی اور کذب شعاری پر رکھی جائے، تو حق کو قبول کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

آپ ناقابلِ تردید دلائل و براہین قاطعہ سے کسی مؤقف کو غلط ثابت کرتے ہیں اگر مدّمقابل کسی غلط فہمی کا شکار تھا، تو حق کو قبول کرلے گا، لیکن اگر جان بوجھ کر غلط مؤقف کو اپنائے ہوئے تھا اور لوگوں کو دھوکا دینے کے نقطۂ نظر سے سب کچھ کہہ رہا تھا، تو حقائق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکے گا۔ غلام رسول مہر نے بڑی محنت سے کہانیاں گھڑ کر "مجاہدین" کی آبرو بنائی۔ اب لوگ حقائق کے آئینے دکھا دکھا کر ان کے بیانات اور توجیہات کو غلط ثابت کردیں تو بھی وہ اپنی خود ساختہ عمارت کو اسی طرح قائم و دائم دیکھنے کی خواہش میں "مجاہدین" کی شان و آبرو ہر حال میں قائم رکھنے کا اعلان کرتے ہیں:

"میں مجاہدین کی شان و آبرو بہر حال قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ بعض سابقہ بیانات اور توجیہات سے عین مطابق نہ ہو۔"

(افاداتِ مہر، ص ۲۳۱)

"افاداتِ مہر" کے مرتب ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنّی نے مانسہرہ میں کسی پمفلٹ کے بارے میں مہر صاحب سے استفسار کیا، تو شاید اس پمفلٹ کے مندرجات ان کی قائم کردہ عمارت کو

کھنڈر میں تبدیل کر دینے والے ہوں گے، اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ میرے تاثر کے مطابق اس پمفلٹ میں سید احمد شہید کے متعلق کچھ زیادہ اچھا نہیں لکھا گیا، یعنی مہر صاحب نے تاثرات و تعصبات کو تحقیق و تاریخ کا نام دے دیا ہے، کمال ہے:

"ایک آپ نے غالباً انگریزی پمفلٹ کے متعلق پوچھا تھا۔ وہ پمفلٹ میں نے کسی زمانے میں پڑھا تھا، انگریزی بہت عمدہ تھی، لیکن سید احمد شہید کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا تھا، میرے تاثر کے مطابق وہ کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔"

("افاداتِ مہر" ص ۲۳۹)

جس دستاویز، تاریخ، تصنیف سے بھی مہر صاحب کو اپنے مفروضوں کی حمایت میں کوئی بات نہ ملے۔ وہ اس کو تاریخی ماخذ قرار نہیں دیتے۔ اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں، یا اسے جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں:

"مجھے دلی افسوس ہے کہ آپ کی کتاب کا وہ حصہ نہ دیکھ سکا جو سرکاری دستاویزات پر مبنی ہے، آپ نے یقیناً دستاویزوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہوگا، لیکن ایک بات عرض کر دوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات یہ دستاویزیں بھی غلط فہمی کا باعث بن جاتی ہیں۔"

(افاداتِ مہر، ص ۷۴، ۱۰۳)

ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی نے مہر صاحب سے ایک خط میں استفسار کیا کہ "تاریخ تناولیاں" طبع ۱۸۷۷ء از سید مراد علی مطبع نور کہاں سے ملے گی؟ (افاداتِ مہر، ص ۱۹۳)

اس کا جو جواب غلام رسول مہر نے ۲۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو پنی صاحب کو دیا، اس میں "تاریخ تناولیاں" کا ذکر تک نہیں کیا اور ان کے اس استفسار کا جواب نہیں دیا۔

شاید ڈاکٹر پنی کے دوبارہ سہ بارہ پوچھنے پر مہر صاحب نے ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کے خط میں لکھا:

"کتاب بازار میں ناپید ہے، پُرانی کتابوں میں اتفاق سے مل جائے تو مل جائے، ورنہ اُمید نہیں کہ ہاتھ آئے" (افادات مہر، ص ۱۹۸)

اس کتاب میں چونکہ حقائق ہیں اور حقائق جہاد کی اصلیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، اس لیے مہر صاحب نے ڈاکٹر سیتی کو اس تاریخی ماخذ تک پہنچنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا، حالانکہ کتاب مہر صاحب کے پاس موجود تھی اور انتقال کے بعد ان کے کتب خانے میں پائی گئی۔ اسی حقیقت کو "تاریخ تناولیاں" مطبوعہ مکتبۂ قادریہ لاہور کے تعارف نگار ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"افسوس کہ ان بہادر اور غیور تناولی مسلمانوں کے مجاہدانہ معرکوں کو کما حقہٗ محفوظ نہ کیا گیا۔ مشہور مورخ غلام رسول مہر نے "تحریک بالاکوٹ" کا جائزہ لیتے ہوئے نہ معلوم کس مصلحت کے تحت "تاریخ تناولیاں" ایسے قدیم ماخذ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ غالباً یہ کتاب ان کی خود ساختہ کہانی کے مطابق نہ تھی"

(تعارف "تاریخ تناولیاں" از محمد عبد القیوم جلوال، ص ۲)

حق کو تسلیم نہ کرنا اور حقائق کو پردوں میں چھپانے کی کوشش کرنا صرف مہر صاحب ہی کا خاصہ نہیں ہے۔ یہ سب حضرات اس میں طاق ہیں مسعود عالم ندوی کو عبید اللہ سندھی پر یہ غصہ ہے کہ وہ سید احمد اور ان کے وہابی ساتھیوں کی کمزوریوں پر تنقید کیوں کرتے ہیں، ان کی مذمت میں کوئی لفظ کیوں کہہ دیتے ہیں۔ بھئی! جب کوئی کام قابل مذمت ہے تو اس کی مذمت اور تنقید میں قلم کو اعتدال پر رکھنے کے کیا معنی ہیں؟

"مولانا سندھی کی کتاب" ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک" وسیع مطالعہ اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے، مگر انہوں نے حزب ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ کی خاطر سید صاحب کے ماننے والوں اور خاص کر اہلِ صادق پور پر بڑا ظلم کیا ہے اور ان کی کمزوریوں کی تنقید و مذمت

ہیں ان کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے۔"

("ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مسعود عالم ندوی ص ۱۰)

جن صادق پور والوں پر ظلم وستم کی دہائی مسعود عالم ندوی دے رہے ہیں، یہ وہی ہیں جن کے متعلق "علماء ہند کا شاندار ماضی" اور "الدر المنثور" کے حوالے سے بتایا جا چکا ہے کہ یہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے مخالف رہے ہے۔

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"اگر سکھ آزادیٔ وطن کے جہاد میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے تو خود ان سے رزم وپیکار کی کوئی وجہ نہ ہوتی اور باشندگانِ علاقہ جات سرحد کی آزادی بھی محفوظ ہو جاتی۔ اس طرح خاصی بڑی قوت فراہم کر کے آزادیٔ پاک ہند کے لیے قدم بڑھایا جا سکتا تھا۔"

(روزنامہ مشرق لاہور، ۱۷ نومبر ۱۹۷۴ء)

مہر صاحب جدید تاریخ کے موجد ہیں، انہوں نے اس تحریک کے حق میں کئی کتابیں لکھیں۔ بیسیوں مضامین تحریر کیے، لیکن کیا وہ خود بھی کہیں یہ ثابت کر سکتے ہیں یا اور کوئی صاحب ثابت کر سکتے ہیں کہ سید صاحب نے آزادیٔ ہند کی بات کی ہو، یا انگریزوں کو اس خطے سے نکال باہر کرنے کا عندیہ ظاہر کیا ہو یا سکھوں سے اس نوع کی کوئی گفتگو کی ہو کہ وہ ان سے مل کر ملک کے غاصبوں (انگریزوں) کے خلاف تحریک چلائیں۔ حالات کی ستم ظریفی یہ ہے اب تاریخ نہیں لکھی جاتی، گھڑی جاتی ہے۔ یوں مہر صاحب ایک "تاریخ ساز شخصیت" کہلانے کے بجا طور پر حقدار ہیں۔ "تاریخ اعیانِ وہابیہ" میں محمد محبوب علی خان لکھنوی نے دلائل وبراہین سے واضح کیا ہے:

"اسماعیل دہلوی اور ان کے مرشد سید احمد بریلوی کی اس جنگ زرگری سے برٹش کو حسبِ ذیل فائدے ہوئے:

(۱) دہلی اور ہندوستان کے دیگر بلاد آسانی کے ساتھ بہادر اور غیرت مند مسلمانوں سے اکثر خالی ہوگئے۔

(۲) مغل سلطنت کے جاں نثار اس کے قرب میں کم ہوگئے۔

(۳) سلطنتِ ہند کی قوت کمزور سے کمزور تر ہوگئی۔

(۴) ہندوستان پر مکمل قبضہ کرنا انگریزوں کو آسان ہوگیا۔

(۵) ان دونوں کی ایجنٹی سے انگریزوں کی قوت بڑھ گئی۔

(۶) ان کی جنگ زرگری سے پنجاب پر بھی انگریزوں کا تغلّب آسان ہوگیا۔

(۷) سرحدی مسلمانوں میں ان دونوں نے پھوٹ ڈال دی۔

(۸) آزاد قبائلیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، انہیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنادیا۔

(۹) قبائلی مسلمانوں کے قتل کے فتحے بار بار لکھے اور شائع کیے۔

(۱۰) پٹھانوں کی طاقت کمزور کرادی۔

(۱۱) کافروں کے مقابل ان کی ہوا خیزی کرائی

(۱۲) کتاب "تقویۃ الایمان" کے ذریعہ مسلمانوں میں نفاق وشقاق کی آگ بھڑکائی۔

(۱۳) دوسری ریاستوں اور حکومتوں کو بھی خطوط و مفیر بھیج بھیج کر پنجاب کی طرف متوجہ کیا اور سلطنتِ مغلیہ کی مدد سے غافل کردیا۔

(۱۴) فرقہ بندی کرائی، گھر گھر لڑائی کرائی۔ کچھ دنوں بعد ہی برٹش نے تغلب کیا اور کچھ دنوں بعد ان کی مدد کی بنا پر انگریزوں نے نہ صرف دہلی بلکہ تمام ہند پر تسلط پالیا۔" (تاریخ اعیانِ دہابیہ، ص ۴۴، ۴۳)

حرفِ آخر

علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور مولوی اسماعیل دہلوی کے سیاسی کردار کے تقابلی جائزے میں درج ذیل حقائق ومعارف سامنے آتے ہیں :

۱- فضلِ حق کے دین کی رو سے اسلام کے دشمنوں اور ملک کے غاصبوں پر جہاد واجب تھا، جبکہ اسماعیل دہلوی کے مذہب کی رُو سے یہ بات فرض تھی کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں کبھی شریک نہ ہوں۔

۲- فضلِ حق کا جہاد صرف انگریز کے خلاف تھا، مگر اسماعیل دہلوی "جہاد سپیشلسٹ" تھے بحث میں جس عالم سے ہار جاتے تھے، اس کے خلاف بھی "جہاد" کا اعلان کر دیتے تھے جو شاعر ان کی ہجو کہتا تھا، اس پر بھی چڑھ دوڑتے تھے۔

۳- فضلِ حق، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے عظیم رہنما تھے۔ جنگِ آزادی میں حصّہ لینے کی پاداش میں انگریزوں نے مُسلمانوں پر ظلم واستبداد کی انتہا کر دی۔ اس کے مقابلے میں اسمٰعیل دہلوی اور سیداحمد کا اعلان تھا کہ سرکارِ انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی۔

۴- فضلِ حق اور ان کے ساتھیوں نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ خادم اور نام لیوا کی حیثیت سے جنگِ آزادی میں حصہ لیا، جبکہ سید احمد بریلوی نے اپنے آپ کو

"مامور من اللہ" کہا، اپنے اوپر الہام ہونے کا دعویٰ کیا اور اسمٰعیل دہلوی کو سید احمد کا خلیفہ بمنزلہ حضرت عمر قرار دیا گیا۔

۵- جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں فضلِ حق خیر آبادی کی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف غیر جانبدار مؤرخین کے علاوہ جانبدار وہابیوں کو بھی کرنا پڑا، وہ اس جنگ کے امام کہلائے۔ اس کے برعکس سید احمد، اسماعیل دہلوی اور ان کے ساتھی "مجاہدین" کو سندھ اور سرحد کے لوگ انگریز کا جاسوس سمجھتے تھے، اسی لیے بُرا سمجھتے تھے اور اس قسم کی حقیقتوں کا اعتراف "تحریکِ مجاہدین" کے نام لیواؤں کو بھی کرنا پڑا۔

۶- فضلِ حق خیر آبادی کے خلاف استغاثے کے گواہ شہادت سے منحرف ہو گئے تو خود انہوں نے اقبالِ جرم کر کے کالے پانی اور شہادت کو خوش آمدید کہا، لیکن اسمٰعیل، سید احمد کے خلاف اس شکایت کی تردید انگریز افسروں نے خود کی کہ یہ انگریز کے مخالف ہیں۔

۷- انگریزوں کی حکومت علامہ فضلِ حق خیر آبادی کے جہاد کا ہدف تھی۔ اس کے مقابلے میں اسمٰعیل دہلوی کے "جہاد" کی راہ میں گورنمنٹ انگلشیہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ ہر طرح کی معاونت کی۔

۸- اسمٰعیل دہلوی مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کے انگریزوں کی راہ سے ہٹ جانے کے بعد سکھوں کو اُن کی راہ سے ہٹانے کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔ ان کی کوششوں سے سکّہ حکومت پر انگریز حکومت فتح یاب ہوئی، جبکہ صرف مغل حکومت باقی تھی، جسے بچانے اور انگریز کا اقتدار ختم کرنے کے لیے فضلِ حق نے جان کی بازی لگائی۔

۹- فضلِ حق نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اس جہاد میں باقاعدہ حصہ لیا۔ اسمٰعیل دہلوی نے حضور پُر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والے مسلمانوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اہلِ اسلام اور سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔

۱۰- فضلِ حق خیر آبادی کو انگریز غاصبوں نے کالے پانی کی سزا دی، جہاں مصائب و شدائد کو برداشت کرتے کرتے وہ شہید ہو گئے اور اسمٰعیل دہلوی اور ان کے تمام ہمراہیوں کو "جہاد" کے لیے تیار کرنے کی خاطر انگریزوں نے کھانے کھلائے، سرحد میں ان کے لیے ہنڈیاں بھجوائیں اور ہر طرح سے ان کو مضبوط و مستحکم کیا۔

۱۱- جنگِ آزادی میں حصّہ لینے والوں کے گھر تباہ کر دیئے گئے، اُن کی جائیدادیں چھین لی گئیں اور "تحریکِ مجاہدین" کو مسلّح ہونے دیا گیا، ان کی "ریاست در ریاست" پر کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ انہوں نے ٹیکس لینے کا اپنا نظام نافذ کیا، تو بھی ان سے نہ صرف صرفِ نظر کیا گیا بلکہ ان کی ہر طرح مدد کی گئی۔

۱۲- فضلِ حق کے جاسوسوں نے ان کے خلاف گواہی دی اور انہیں سزا دلوائی۔ اسمٰعیل صاحب کے جاسوسوں کی رپورٹ پر انگریز افسروں نے ان کی سرگرمیوں سے کوئی تعرض نہ کرنے کی پالیسی جاری رکھی۔

۱۳- فضلِ حق نے عدالت میں اپنے فتویٰ جہاد پر اصرار کیا۔ اسمٰعیل دہلوی نے انگریزوں کی خوشحال رعایا ہونے کا اقرار کیا۔

۱۴- فضلِ حق انگریزوں کی حکومت کی مخالفت میں جزائر انڈمان تک گئے اور وہیں شہادت پائی۔ اسمٰعیل دہلوی انگریز حکومت کے استحکام کی خاطر سکھوں اور سرحدی مسلمانوں سے جہاد کرنے بالاکوٹ تک گئے اور مسلمانوں کے ہاتھوں "شہید" ہو گئے۔

۱۵- فضلِ حق نے والیانِ ریاست کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکسایا اور سید احمد بریلوی نے سرحدی امراء کو خط لکھے، جن میں سکھوں اور مخالف مسلمانوں کے قلع قمع کے عزائم کا اظہار کیا۔

۱۶- فضلِ حق نے مسلمانوں کو دین کی اصل پر قائم اور متحد رکھنے کے لیے کام کیا اور اسمٰعیل صاحب نے مسلمانوں کی تکفیر کی اور ان میں پھوٹ ڈالی۔

۱۷۔ فضلِ حق خیرآبادی انگریز کی مخالفت میں الور سے دہلی، دہلی سے لکھنؤ کئی جگہوں پر گئے اور اسماعیل دہلوی اس حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے یوپی سے سندھ، پنجاب، سرحد ہر جگہ گئے

۱۸۔ فضلِ حق غیر ملکی غاصبوں سے نفرت کرتے تھے۔ اسمٰعیل دہلوی غیر ملکی غاصبوں کی فرماں برداری پر مفتخر تھے۔

۱۹۔ فضلِ حق خیرآبادی جنگ آزادی کے سرکردہ لیڈر جنرل بخت خاں اور بہادر شاہ ظفر کے معتمد اور مشیر تھے اور اسماعیل و سید احمد انگریز حکّام کے معتمد تھے۔ سرحد میں ان کے جاسوس سمجھے گئے اور انگریزوں نے انہیں ہر قسم کی مراعات دیں۔

۲۰۔ فضلِ حق خیرآبادی بہادر شاہ ظفر پر زور دیتے تھے کہ مجاہدوں کی ہمت افزائی کریں اور انہیں بہتر معاوضہ دیں۔ اسماعیل و سید احمد سرحدی قبائل کی نوجوان لڑکیوں سے زبردستی نکاح کرتے تھے اور ان کے انکار پر ان کے خلاف "جہاد" کا عَلَم اٹھا لیتے تھے۔

ان واقعات کی روشنی میں قارئین کرام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ برِصغیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں کس نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ آزادی کی لگن کس کے دل و دماغ میں تھی اور کس کا "جوہرِ ادراک" انگریز حکام نے خرید رکھا تھا ؎

یہ تو ہے دورِ شکست و ریخت اے نازک مزاج
زد پہ شاید تیرا شیشے کا مکاں بھی آئے گا!

کتابیات

آثار الصنادید ۔ سرسید احمد خاں، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی
آزادی کے مجاہد۔ محمود الرحمان، نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۷۳ء
اُردو انسائیکلو پیڈیا ۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۶۸ء
اُردو (سہ ماہی) کراچی، انجمن ترقی اُردو، کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء
اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور
اُردوئے معلیٰ (ماہنامہ) علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۔ مرتبہ خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۸ء
۱۸۵۷ء کے کوائف و صحائف ۔ ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، کراچی ۱۹۵۷ء
اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد ۔ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور ۱۹۶۰ء
افاداتِ مہر ۔ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
اکابرِ تحریکِ پاکستان ۔ محمد صادق قصوری، مکتبۂ رضویہ، گجرات
الاسلام (ہفت روزہ) لاہور، ۵ اگست ۱۹۷۷ء
الاقتصاد فی مسائل الجہاد، ابو سعید محمد حسین لاہوری، ایڈیٹر رسالہ اشاعۃ السنّۃ
مطبوعہ وکٹوریہ پریس، تالیف ۱۸۷۶ء اشاعت ۱۸۷۹ء
البلاغ (ماہنامہ) کراچی، فروری ۱۹۶۹ء
الحیات بعد الممات ۔ فضل حسین بہاری، مکتبہ سعودیہ، حدیث منزل، کراچی ۱۹۵۹ء
الزبیر (سہ ماہی) بہاول پور، تحریکِ آزادی نمبر ۱۹۷۰ء
ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ۔ مفتی انتظام اللہ شہابی، دینی بک ڈپو، دہلی

باغی ہندوستان (الثورۃ الہندیۃ) مولانا محمد فضل حق خیر آبادی، مترجم عبدالشاہد خان شروانی
مرتبہ مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری، مکتبہ قادریہ لاہور، ۱۹۷۴ء
بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ سید رئیس احمد جعفری، کتاب منزل لاہور ۱۹۵۶ء
تاریخ اعیانِ وہابیہ۔ محمد محبوب علی خاں لکھنوی، کتب خانہ اہل سنت، بمبئی ۱۳۷۲ھ
تاریخ اہل حدیث۔ میر ابراہیم سیالکوٹی، اسلامی پبلشنگ کمپنی، لاہور
تاریخ تناولیاں۔ سید مراد علی، مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۰۵ء
تحریک ریشمی رومال۔ حسین احمد مدنی، کلاسیک۔ لاہور ۱۹۶۰ء
تذکرۂ علماء ہند۔ رحمان علی، نولکشور لکھنؤ، ۱۹۱۴ء
تذکرۂ علمائے ہند۔ رحمان علی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء
ترجمانِ وہابیہ۔ نواب محمد صدیق حسن خاں، مطبع محمدی، لاہور، ۱۳۱۲ھ
ترجمانِ اہلِ سنت (ماہنامہ) کراچی۔ جنگ آزادی نمبر، جولائی ۱۹۷۵ء
جامعہ (ماہنامہ) دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء
جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء خورشید مصطفےٰ رضوی، مکتبہ برہان دہلی ۱۹۵۹ء
جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد، مولانا فیض احمد بدایونی، محمد ایوب قادری، پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۵۷ء
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) محمد ایوب قادری، پاک اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۶ء
حیاتِ سید احمد شہید۔ محمد جعفر تھانیسری، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۸ء
حیاتِ شبلی۔ سید سلیمان ندوی، مطبوعہ اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء
حیاتِ طیبہ۔ مرزا حیرت دہلوی، مطبع فاروقی، دہلی
حیاتِ طیبہ۔ "سیرت شاہ اسماعیل شہید" مرزا حیرت دہلوی، مکتبۃ الاسلام لاہور، ۱۹۵۸ء
حریت (روزنامہ) کراچی، جمعہ ایڈیشن، ۹ جولائی ۱۹۷۷ء
خدام الدین (ہفت روزہ) لاہور، ۲۳ نومبر ۱۹۶۲ء
خیال (مجلہ) لاہور، سن ستاون نمبر

خون کے آنسو۔ مشتاق احمد نظامی، مکتبہ حامدیہ لاہور ۱۹۷۳ء
داستانِ تاریخ اُردو۔ حامد حسن قادری لکشمی نرائن اگروال آگرہ ۱۹۵۴ء
روضۃ الادباء۔ مولوی محمد دین، انجمن پنجاب، لاہور، ۱۸۷۹ء
ستارہ یا بادبان۔ محمد حسن عسکری، مکتبہ سات رنگ، کراچی ۱۹۶۳ء
۵۷ء کے ہیرو۔ شیدہ انیس فاطمہ بریلوی، اقبال بک ڈپو، کراچی ۱۹۵۶ء
سوانح احمدی۔ محمد جعفر تھانیسری، مطبع فاروقی، دہلی
سوانح احمدی۔ محمد جعفر تھانیسری، صوفی کمپنی، منڈی بہاء الدین ۱۳۵۲ھ
سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ (روزنامہ) لاہور، ۱۰ر نومبر ۱۸۷۰ء
سید احمد شہید۔ غلام رسول مہر
سید احمد شہید کی صحیح تصویر۔ وحید احمد مسعود، مکتبہ مسعود، لاہور، ۱۹۶۷ء
سیرتِ سید احمد شہید۔ سید ابوالحسن علی ندوی، ایم ایچ سعید اینڈ کمپنی کراچی، ۱۹۵۸ء، ۱۹۷۴ء
شاہ اسمٰعیل شہید۔ مرتبہ عبداللہ بٹ، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۴ء
صراطِ مستقیم۔ محمد اسماعیل دہلوی، مطبوعہ مطبع احمدی، لاہور
علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) مترجم معین الدین افضل گڑھی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۱۹۶۱ء
علماء ہند کا شاندار ماضی۔ جلد ۲، ہندوستانی مسلمان اور جنگ آزادی
سید محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند، ایم برادرس دہلی ۱۹۵۷ء
علماء ہند کا شاندار ماضی۔ جلد ۳، علماء صادق پور اوران کے پُراسرار مجاہدانہ کارنامے، ایم برادرس دہلی ۱۹۵۷ء
علماء ہند کا شاندار ماضی۔ جلد ۴، ۱۸۵۷ء اور جانبازانِ حریت، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی
علماء حق اوران کی مظلومیت کی داستانیں۔ مفتی انتظام اللہ شہابی
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر۔ نادم سیتاپوری، مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی
غالب نام آورم۔ نادم سیتاپوری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء
غالب نامہ۔ شیخ محمد اکرام۔ مرکنٹائل پریس لاہور، ۱۹۴۰ء

غدر کے چند علماء - مفتی انتظام اللہ شہابی

فریادِ مسلمین - منشی محمد حسین محمود، مطبع ریاضِ ہند، امرتسر

فضلِ حق اور سن ستاون - حکیم محمود احمد برکاتی، برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء

کابل میں سات سال - عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی، لاہور

کالا پانی (تواریخِ عجیبہ) محمد جعفر تھانیسری - سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۲ء

لیل و نہار (ہفت روزہ) لاہور، جنگِ آزادی نمبر، ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء

ماہِ نو (ماہنامہ) کراچی، خاص نمبر، بیادگارِ تحریکِ آزادی، مئی ۱۹۵۷ء

ماہِ نو (ماہنامہ) کراچی، تحریکِ پاکستان نمبر ۱۹۶۸ء

مخزنِ احمدی - سید محمد علی، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۲۶۱ھ

مسلمانوں کا روشن مستقبل - سید طفیل احمد منگلوری، کتب خانہ عزیزیہ، دہلی ۱۹۴۵ء

مشاہداتِ کابل و یاغستان - محمد علی قصوری ایم اے کیمبنٹ، انجمن ترقی اُردو، کراچی

مشرق (روزنامہ) لاہور، ۱۷ نومبر ۱۹۷۴ء

مقالاتِ سرسید - حصہ نہم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۲ء

مقالاتِ سرسید، حصہ شانزدہم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء

مکتوباتِ سید احمد شہید - مترجم سخاوت مرزا، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۹ء

موجِ کوثر - شیخ محمد اکرام، فیروز سنز لاہور، ۱۹۵۸ء

نقشِ حیات - حسین احمد مدنی، اسلامی اکادمی لاہور، بیت التوحید، کراچی

نوائے وقت (روزنامہ) لاہور، ۲۵ اگست، ۱۹۴۷ء

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک - مسعود عالم ندوی، دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۴۶ء

○

امتیازِ حق

ارباب تحقیق کی نظر میں

مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ رضویہ
اندرون لوہاری دروازہ لاہور

حافظ ڈاکٹر محمد عادل

معتمدِ عمومی، انجمن اسلامی عمرانیات پاکستان کراچی

اس کتاب کے سرورق پر یہ عبارت پڑھ کر ہی کتاب کا موضوع سمجھ میں آجاتا ہے :
"فضل حق خیر آبادی اور اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ"

کتاب کی تھوڑی سی عبارت پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ اس شدت کا ردِ عمل ہے جو سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے بعض معتقدین نے مولانا فضل حق خیر آبادی کے مرتبے کو گھٹانے میں روا رکھی ہے۔ مولانا فضلِ حق اور ان کے والد بزرگوار مولانا فضل امام دونوں جید عالم اور اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے۔ دونوں کو معقولات میں جو تبحر حاصل تھا، اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ وہ یونانی اور اسلامی دورِ عروج کے مفکرین اور حکماء کی صف میں کھڑے کیے جانے کے قابل ہیں۔ اس دور میں جس طرح خانوادۂ ولی اللّٰہی نے منقولات خصوصاً علم حدیث کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلایا اور آج بھی اس کے اثرات پورے برصغیر میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح مولانا فضل امام اور مولانا فضلِ حق نے معقولات سے اس قدر فیض پہنچایا کہ بعد کی کوئی قابل ذکر ہستی ایسی نہیں نکلے گی جس کو اس میں سے کچھ نہ کچھ حصہ نہ ملا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے اس دور کو دو متضاد کیفیات سے متصف کیا تھا۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانانِ ہند کا زوال اور علمی اعتبار سے کمال۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی کہ اس دور کے سیاسی زوال کا منشاء اور فرمانرواؤں کی کمزوری، نااہلی اور بے بسی کے سبب ہی علماء کو سیاسی معاملات میں عملی طور پر حصہ لینا پڑا۔ اس کی ابتداء حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی نے کی۔ آپ نے جب مرہٹوں کے غلبہ اور

استیلا کی شدت کو محسوس کیا، تو اس دور کے مسلمان فرمانرواؤں خصوصاً نجیب الدولہ کو للکارا، اور اس بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ جنگ پانی پت سویم نے مرہٹوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا اور ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کو اپنی طاقت بحال کرنے کا موقع فراہم کر دیا، لیکن مسلمان اس کامیابی کے بعد پھر خوابِ خرگوش میں چلے گئے اور دشمنانِ دین نے موقع سے فائدہ اٹھا کر برصغیر کے مختلف حصوں پر قبضہ کر لیا۔ مرہٹے دہلی کے تخت پر تو نہ بیٹھ سکے، البتہ مغلیہ فرمانروا شاہ عالم ثانی کو اپنے قبضہ میں کر کے بالواسطہ طور پر مغلیہ سلطنت کے بچے کھچے حصوں پر حکومت کرنے لگے۔ ادھر انگریز بنگال اور دکن کی طرف سے بڑھتے ہوئے دوآبے کے علاقے تک پہنچ گئے اور ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۴ء میں انہوں نے سندھیا کی فوجوں سے لڑ کر علی گڑھ، آگرہ، دہلی اور گنگا جمنا کے درمیانی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں نے یہ حالت دیکھی، تو وہ پنجاب، صوبہ سرحد اور کشمیر پر قبضہ جما بیٹھے اور انہوں نے وہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ انگریز نے چالاکی سے کام لیا اور یہ محسوس کر لیا کہ چند ہزار گورے اتنے بڑے ملک پر تنہا حکومت نہیں کر سکتے۔ لامحالہ مقامی لوگوں سے کام لینا پڑا، لہٰذا ابتداءً اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا، تاہم شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے یہ محسوس کر لیا کہ سکھ ہوں یا انگریز یا ہندو "اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ" کے بموجب سب ایک ہیں اور مسلمانوں کے سب ہی دشمن ہیں۔ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور جہاد پر برصغیر کے مسلمانوں کو اکسایا۔ جہاد کی تحریک کو چلانے کے لیے اپنے مریدِ خاص سید احمد، اپنے بھتیجے شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی کو منتخب کیا۔ ان لوگوں نے شمالی ہندوستان کا دورہ کر کے مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا اور قریہ قریہ میں جا کر جہاد کے لیے بیعت لی۔ تیاری مکمل کرنے کے بعد سرحدی علاقہ کو جہاد کے لیے نقطۂ آغاز بنایا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انگریز سے بھی لڑنا تھا، تو پہلے ان سے کیوں نہ نمٹے اور قریب کے شہر کو چھوڑ کر اس قدر دور دراز کے علاقے کو جہاد کا مرکز کیوں بنایا۔ اس سے معاندین نے ایک نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ یہ لوگ انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ ان ہی کے ایماء پر انہوں نے سکھوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا تاکہ ان کی طاقت کمزور ہو جائے اور بعد میں

انگریز آسانی سے برِ صغیر کے اس علاقہ پر بھی قبضہ کر لیں۔ یہ لوگ مخالفت کے جوش میں اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اگر انگریز کی شہ پر مجاہدین نے جہاد کا ڈھونگ رچایا تھا، تو پھر انہوں نے اپنی مہم کا آغاز دہلی کی طرف سے کیوں نہ کیا۔ اس صورت میں تو وہ اپنے علاقہ سے بھی قریب رہتے اور انگریزوں سے بھی آسانی کے ساتھ ہر طرح کی امداد ملتی رہتی۔ اپنے امدادی مراکز سے کٹ کر غیر علاقہ میں جنگی مہم کا آغاز صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو فنونِ حرب میں کورا اور عقل سے بالکل پیدل ہو۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے بارے میں اور جو کچھ چاہیں کہہ لیں، لیکن ان دونوں کو فنونِ حرب سے بیگانہ نہیں کہا جا سکتا۔ جنہوں نے سید احمد شہید کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی عملی زندگی کا آغاز ہی فوجی ملازمت سے ہوا تھا، وہ ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں کی فوج میں رہ چکے تھے اور انہوں نے کئی معرکوں میں حصہ لیا تھا، لہٰذا ان کو فنونِ حرب کا پورا تجربہ تھا۔ شاہ اسمٰعیل شہید کئی سال ان کی زیرِ تربیت رہے، اس لیے انہیں بھی جنگی چالوں سے بیگانہ نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخی حقائق کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تحریکِ مجاہدین انگریزوں کے خلاف بھی تھی اور سکھوں کے خلاف بھی، لیکن چونکہ اس وقت انگریز کی پالیسی نرم تھی، اس لیے اس کے مقابلہ کو موخر کیا جا سکتا تھا۔ سکھوں کے علاقوں میں مظالم ہو رہے تھے اور ان کی خبریں برابر دہلی پہنچ رہی تھیں، اس لیے ان سے فوراً نمٹنا ضروری تھا۔ صوبہ سرحد کو مرکز اس لیے بنایا گیا تھا کہ مسلم مجاہدین کو جانباز پٹھانوں کی قوت بھی میسر تھی ——— اور دوسری جانب کی اسلامی حکومتوں سے فوج، اسلحہ اور رسد کی شکل میں امداد ملنے کی بھی پوری توقع تھی، چنانچہ ابتداءً ان کی یہ پالیسی کامیاب رہی۔ کچھ علاقہ پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا اور وہاں اسلامی اصولوں پر ایک حکومت قائم کر لی گئی۔ اس علاقہ کے عام باشندے اس نظام سے خوش اور مطمئن تھے، لیکن ایک دو سرداروں نے دنیوی فوائد کے لالچ میں مجاہدین سے غداری کی اور ایک اسلام دشمن قوم کے ہاتھوں جہاد کی اس شاندار تحریک کا خاتمہ ہو گیا اور ان دونوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس تحریک کے دوران مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کا کردار یہ رہا کہ وہ نہ انگریز کی مخالفت میں سر سے کفن باندھ کر نکلا اور نہ سکھوں سے

نبرد آزمائی پر تیار ہوا، البتہ جب بالاکوٹ کے خونچکاں واقعہ کی اطلاع دہلی پہنچی تو اس گروہ نے اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی ناکامی کی خوشی میں جشن منایا اور قصیدے لکھے۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنی مشہور کتاب "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں :

"چنانچہ مولوی اسمٰعیل صاحب نے جب جہاد میں شکست کھائی اور دلی میں خبر آئی تو انہوں (شاہ نصیر) نے اس موقع پر ایک طولانی قصیدہ کہا۔ دو شعر اس میں سے اس وقت یاد ہیں ؎

کلام اللہ کی صورت، ہوا دل ان کا سیپارہ
نہ یاد آئی حدیث ان کو، نہ کوئی نقش قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے
اگرچہ تھے دمِ شملہ سے وہ شیرِ نیستانی"

ایک سچے اور پکے مسلمان کے دینی جذبہ کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ ان اشعار میں مجاہدین کے ساتھ قرآن اور حدیث کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے۔ عقل اس بات کو جاننے سے قاصر ہے کہ مجاہدین کی تحریک کو اسلام کے منافی قرار دینے والا گروہ اس وقت اسلام کی کیا خدمت کر رہا تھا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء واقعہ بالاکوٹ کے پورے چھبیس سال بعد لڑی گئی۔ اس وقت نہ سید احمد شہید دنیا میں موجود تھے اور نہ شاہ اسمٰعیل شہید۔ البتہ ان کے معتقدین و متوسلین کی ایک جماعت موجود تھی۔ ان میں سے کچھ دہلی میں اور کچھ نے نواحی بستیوں میں رہتے ہوئے انگریز کے خلاف جہاد کیا اور عملی حصہ لیا۔ یہی نہیں، بلکہ مجاہدینِ بالاکوٹ میں سے بچے کھچے لوگ اس کے بعد بھی برابر انگریز سے معرکہ آرا ہے اور اس کی سزا بھگتیں۔ بہاں تک فتویٰ جہاد کرنے کا تعلق ہے یقیناً اس کی تیاری کا کام مولانا فضلِ حق کے ہاتھوں ہوا ہوگا لیکن جنگ میں عملی حصہ لینے کی کوئی شہادت کسی روزنامچہ یا تذکرہ سے نہیں ملتی۔ صرف عبداللطیف نے اتنا لکھا ہے: "۱۹ اگست کو مولانا فضلِ حق صاحب بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئے اور انہوں نے کسی منصب کی خواہش کی۔ بادشاہ نے انہیں صبر سے کام لینے کی تلقین کی۔"

جنگ کے بعد انگریزوں نے انہیں فتویٰ کی تیاری کے جرم میں ہی کالے پانی کی سزا دی، جہاد میں عملی حصہ لینے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اپنے دور کے دو مختلف اکابرین ہیں جنہوں نے دشمنانِ اسلام سے جہاد کیا۔

آپ کی کتاب اس موضوع پر اچھی ہے۔ زبان کی حلاوت، موقع کے لحاظ سے اشعار کی بندش اور اپنا نظریہ پیش کرنے کی سعیٔ بلیغ ہے لیکن تاریخی اور عمرانیاتی پہلوؤں سے تجزیہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اشہبِ فکر جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا ہے۔ بہرحال حق کے متلاشی کی جستجو ختم نہیں ہوتی، وہ برابر حق کی تلاش میں کوشاں رہتا ہے۔ ع

ترا یابم کہ نہ یابم جستجوئے می کنم

پروفیسر سید مسعود علی

پرنسپل گورنمنٹ کالج کھپرو (سندھ)

زیرِ نظر کتاب "امتیازِ حق" میں راجا غلام محمد صاحب نے بڑے مدلل طریقے سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی امتیازی کوشش کی ہے جو قابلِ ستائش ہے۔

اس کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے اس وقت کے حالات پر کچھ روشنی ڈالی جائے جس زمانے کی یہ دونوں مقتدر ہستیاں پیداوار ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیاں مسلمانوں کے انحطاط و زوال کی صدیاں ہیں۔ مسلمان ہر جگہ مغلوب و مفتوح اور ذلیل و خوار ہو تے۔ ان کی سب سے بڑی سلطنت "سلطنتِ عثمانیہ" بھی انحطاط پذیر ہو چکی تھی۔ اس طرح مسلمانوں کی طاقت و سطوت کو زنگ لگ چکا تھا اور سیاسی طور پر وہ ہر جگہ کمزور ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو چکی تھی اور انگریزوں کا غلبہ روز افزوں تھا۔

ان کے ساتھ یہاں کی دیگر قومیں ہندو، مرہٹے اور سکھ اسلام دشمنی کی بنا پر ان کی حمایت کار اور مددگار بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح یہ ان کے زیر دست سیاسی حلیف تھے۔ سراج الدولہ، حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے غیور اور عزت مند حکمران شکست کھا چکے تھے اور دہلی انگریزوں کے قدموں تلے آچکی تھی۔ ایسے پُر آشوب وقت میں جبکہ سیاسی، دینی و مذہبی، معاشی و معاشرتی طور پر مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا، چند مقتدر علماء حضرات ملتِ اسلامیہ کو غلامی سے نجات دلانے کی فکر میں سرگرداں تھے اور قوم کو بیدار کرنے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔

انہی علماء حضرات میں مولانا فضل حق خیر آبادی، سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید بھی شامل تھے جنرل بخت خاں و دیگر فوجی سردار پیشہ کے اعتبار سے انگریزوں کی غلامی و محکومی سے نجات پانے کی خاطر فوجی حکمتِ عملی سے بھی کام لے رہے تھے۔ ان کے جذبۂ جہاد کو بیدار کرنے میں مولانا فضل حق خیر آبادی بھی ان کے ہمنوا تھے۔

سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید بھی جداگانہ حکمتِ عملی میں پیش پیش تھے اس طرح تحریکِ مجاہدین کے رہبر اپنے جداگانہ عقیدہ، نظریہ اور حکمتِ عملی میں ایک دوسرے کے حریف بن گئے تھے گو کہ ہر گروپ کا مقصد ایک ہی تھا، یعنی مسلمانوں کو غلامی، محکومی اور پس ماندگی سے نجات دلانا۔ فضل حق خیر آبادی صاحب کچھ زیادہ قدامت پسند عالم تھے اور اس کے برخلاف سید احمد صاحب و اسمٰعیل دہلوی صاحب، محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تعلیمات و تحریکات سے متاثر ہو کر عالمِ اسلام میں ایک نئی رُوح پھونک کر جس میں حکمتِ عملی کا غلبہ تھا، مسلمانوں کو ذلت سے نکالنا چاہتے تھے، لیکن عقیدہ کے اختلافات سے یہاں اتنی بڑی خلیج پیدا ہو گئی کہ آگے چل کر بریلوی اور دیوبندی مدرسہ ہائے فکر کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔

اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر اگر جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ "امتیاز حق" در اصل فضل حق خیر آبادی اور سید احمد بریلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ نہیں، بلکہ ہر دو مدرسہ ہائے فکر کے درمیان اختلاف کو ہوا دینا ہے اور آج کا مؤرخ علمائے دین اور تحریکِ مجاہدین کے کردار

کو گھٹانے اور بڑھانے میں مصروف تر نظر آتا ہے۔ یہی کوشش اس کتاب کے مصنف کی عکاسی کرتی ہے۔ کسی بھی دو نظریوں یا اشخاص کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ مصنف غیر جانبدار ہو اور متنازعہ ہو۔ راجا غلام محمد صاحب جو اس کتاب اور مقالے کے خالق ہیں، ہمیں غیر جانبدار نظر نہیں آتے۔ صفحہ ۲۴، صفحہ ۵۳ و دیگر صفحات پر وہ مولانا غلام رسول مہر پر اپنی ناراضگی اور برہمی کا اظہار سخت و کرخت الفاظ میں کر کے اپنی ذاتی علمی اور مذہبی مخالفت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنے سے پہلے ان کے ذہن میں اسمٰعیل دہلوی اور دیگر رفقاء کو زیر کر کے مولانا فضل حق کے کردار کو زیر کرنا مقصود ہے۔

دراصل عقیدے کے ٹکراؤ اور مذہبی مخالفت نے آج بھی یہی صورت اختیار کر رکھی ہے اور اسلام پسند جماعتیں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں مصروف ہیں اور مملکتِ پاکستان کو استحکام میسر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمان آج بھی دینی بصیرت سے ناآشنا ہے جس کے سبب سوشلزم، کمیونزم، نصرانیت اور یہودیت کا عالمِ اسلام پر غلبہ ہے۔ نزاعی اختلاف کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے۔

ہمارا اپنا مطالعہ یہی ہے کہ "تحریکِ مجاہدین" کے رہبروں میں دونوں گروہوں کی مساعی و کوششیں کارفرما رہی ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے موجِ کوثر میں سید احمد شہید و اسماعیل شہید کے ملی جذبہ کو خوب سراہا ہے اور مبلغِ دین کا علمبردار قرار دیا ہے۔ بہر حال اس کتاب سے قارئین اور مصنفین کے اختلافات کی راہیں طویل ہونے کے مواقع زیادہ ہیں۔

حوالے ایسے دیئے گئے ہیں کہ جن کی مدد سے اسمٰعیل شہید و بریلوی شہید کے حامیوں کو انگریزوں کا جاسوس بتایا گیا ہے۔ تنقید و دلائل سے اختلافات بجائے گھٹنے کے بڑھتے ہی جائیں گے اور ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہے گا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر دو گروپ نے اپنا اپنا کردار نہایت حوصلہ مندی اور اعلیٰ ظرفی سے ادا کیا اور تاریخ کے اوراق ان کے سیاسی کردار اور جذبۂ ملی کے ثنا خواں ہیں۔ مولانا فضل حق صاحب کا اپنا ایک اعلیٰ مقام تھا، ان کی فضیلت اور علمی بصیرت کا ہر کوئی مداح ہے۔ سندھ سے تحریک کے مجاہدین

سیّد احمد شہید کی سربراہی میں ۲۷-۱۸۲۶ء میں گزرے۔ یہاں ان کی بڑی آؤبھگت کی گئی۔ سندھ کے مشہور وقائع نگار منشی عطا محمد شکارپوری نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اختلاف قدامت پسندی و نئی روشنی کی تحریک کا تھا، لیکن مذہبی اختلاف کوئی نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیاسی رہبری حاصل کرنے کی خواہش نے ان کے درمیان کشمکش پیدا کر دی ہو، لیکن دونوں گروپ انگریزوں کی بالادستی اور سکھوں کی اسلام دشمنی کے خلاف تھے۔ مولانا فضلِ حق نے غلامی کے جوئے کو اتار پھینکنے کی خاطر دہلی کو میدان بنایا اور سیّد احمد شہید و دیگر رفقائے کار نے ہندوستان سے جا کر شمالی افغانستان سے حملہ کر کے سکھوں کو نابود کرنے کی کوشش کی جنہوں نے بے کس مسلمانوں پر بے انتہا مظالم ڈھائے۔

اگر وہ انگریز کے جاسوس ہوتے، تو افغان انہیں اپنے ملک میں کبھی بھی داخل نہ ہونے دیتے۔ انگریزی تسلّط کو مصلحتاً قبول کر لینا سرسیّد نے بھی قبول کیا تھا، کیونکہ ازلی دشمن داخلی تھا، خارجی نہ تھا۔ یہی نظریہ سیّد احمد شہید و اسمٰعیل شہید کا بھی ہو سکتا ہے کہ سکھوں کے جہاد پر غلبہ پانے کے بعد انگریزوں کی خبر لینی ہے۔

مختصر یہ کہ جارحانہ انداز کے برعکس معتدل رویّہ اختیار کرنا مصنّف کے لیے سودمند ثابت ہوتا۔ جارحانہ انداز جانب داری کے شکوک پیدا کرتا ہے اور اس سے اس کتاب کی صحت پر اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ مخالف گروپ کے لیے تابڑ توڑ حملوں کا سلسلہ دراز ہونے کا پورا امکان ہے جس سے اختلافات کی راہیں مسدود ہونے کے بجائے کشادہ ہوتی چلی جائیں گی اور غیر اقوام کو فائدہ ہوتا رہے گا۔ مسلمانوں کو غیروں کے بجائے اپنوں ہی سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ خلیج کو پاٹنے کی کوششیں تیز تر کی جائیں۔

پروفیسر محمد قاسم

گورنمنٹ انٹر کالج ۔ راوی روڈ لاہور

"تاریخ نگاری ایک ایسا فن ہے جس کی عکاسی کرنے کے لیے مؤرخ کو نہ صرف صحیح حالات کا اندازہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے اس کا کردار، عقیدہ اور دماغ بھی درست ہونا چاہیے۔ صحیح مورخ وہی ہو سکتا ہے اور غیر جانبدار اور مکمل حالات وہی بیان کر سکتا ہے جس کا اپنا کردار بے داغ ہو اور وہ غیر جانبداری کی روش پر چل رہا ہو، نہ کہ کسی کی کاسہ لیسی میں دن گزار رہا ہو اور پھر کسی تحریک، یا تنظیم کے متعلق جاننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے فکر کے بارے میں جانا جائے اور اس کی تعلیمات کو مدِ نظر رکھ کر ہی اس کی صحیح عکاسی کی جا سکتی ہے۔ کچھ لکھنے سے پہلے میں تاریخ نگاری کا صرف ایک اصول بتاتا ہوں کہ زمانہ مستقبل کا مؤرخ اپنے ماضی کی تاریخ کیونکر صحیح بتا سکتا ہے

کسی واقعہ یا حالات کی تصویر تو ہر کوئی ایک جیسی یا پھر معمولی رد و بدل سے پیش کر دیتا ہے، مگر کسی کی زندگی کے حالات کے متعلق لکھتے وقت تین آرا مؤرخ کے سامنے آتی ہیں۔ ایک مکمل جانبدار رائے جس میں موصوف کی ہر برائی کو ایسے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھی نیکی معلوم ہو جیسے ابوالفضل فیقی نے اکبر کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا اور اسے درحقیقت خدا بنا دیا۔ دوسری رائے مکمل مخالفت پر مبنی ہوتی ہے کہ لکھنے والا موصوف کے ہر فعل کو چاہے وہ اچھا ہی ہو، اس انداز میں پیش کرے کہ قاری موصوف کو شیطان کا چیلہ سمجھے۔ تیسری اور قابلِ عمل رائے جس کو قاری بہتر اور صحیح سمجھ سکتا ہے، وہ ہے کسی غیر جانبدار شخص کی رائے۔

کسی شخص کے حالاتِ زندگی جاننے کے لیے آپ ان تینوں آرا میں سے کس کو بہتر سمجھیں گے۔ یقیناً تیسری رائے کو۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے زیرِ نظر کتاب "امتیازِ حق" کے مصنف، کے بارے میں خود فیصلہ

کرلیں کہ وہ تاریخ نگاری کے ان تینوں اصولوں میں سے کس پر عمل کر رہا ہے۔ رہا معاملہ کتاب کے مندرجات کا تو ان کا مختصر جائزہ ذیل میں درج ہے:

اوّل یہ کہ شاہ اسمٰعیل شاہ عبدالعزیز بن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مرید تھے نہ کہ سید احمد دہلوی (۲) کے۔ شاہ اسمٰعیل اور عبدالحی صاحب کافی عرصہ سے شاہ عبدالعزیزؒ کے ساتھ مل کر شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے مدرسہ رحیمیہ میں کام کرتے رہے تھے اور اپنے والد بزرگوار کی تعلیمات کی روشنی میں شاہ عبدالعزیز نے ہی جہاد کی خاطر تنظیم کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ان کے مدنظر دونوں ہی دشمن یعنی انگریز اور سکھ تھے۔ سید احمد دہلوی (۲) کافی عرصہ بعد اس تنظیم میں شامل ہوئے تھے چونکہ وہ علوم عربی سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے اس لیے ان کو اس تنظیم کا سربراہ بنا دیا گیا اور شاہ اسمٰعیل اور عبدالحی دونوں صاحبان کو معاون مقرر کیا گیا' اس لیے اگر سید احمد کا کوئی مرید کار ان کو نعوذ باللہ اتنا بڑھا کر پیش کرتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمرؓ کی مثال گردانتا ہے' تو یہ اس کے ایمان کی کمزوری ہے نہ کہ ان اصحاب کی۔ اگر کوئی شریف النفس والدین کا بیٹا خود کو حرامی مشہور کرتا پھرے اور والدین پر تہمت دے تو اس میں قصور والدین کا تو نہیں۔

دوم: سکھوں کے خلاف جہاد کے بارے میں راجا غلام محمد نے کہا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کیوں نہ کیا۔ یہ سوال کرنے سے پہلے انہیں اس وقت کے حالات کا اور انگریز کی پالیسی کا اندازہ ضرور ہونا چاہیے۔ کیا اس وقت کوئی ایسی مسلم طاقت برصغیر میں موجود تھی جو برطور مسلمانوں کی انگریز کے خلاف جہاد میں مدد کر سکتی۔ کیا تمام مسلم ریاستیں انگریز کی باجگزار نہ تھیں۔ کیا دو عملی نظام کے تحت ان کی خود مختاری قائم تھی (نہیں)۔ تو وہ کس طور مسلمانوں کی مدد کرتے۔ بلکہ اس تنظیم کے پاس خود اتنے وسائل نہ تھے کہ جنگ کی صورت میں رسد کا تسلسل قائم رکھ سکے اور پھر اس وقت انگریز کو بہر صورت اپنا اقتدار قائم رکھنا مقصود تھا۔ اس لیے اس نے مسلمانوں کی عبادات و رسومات میں کسی قسم کا دخل نہ دیا، مگر سکھ جو کشمیر اور پنجاب پر قابض تھے۔ کیا ان کے زیر اثر مسلمانوں کو اپنی مذہبی ذمہ داریاں نبھانے کی اجازت تھی۔ کیا وہ اذان دے سکتے تھے۔ کیا اصلاحیہ تبلیغ دین کر سکتے تھے۔ کیا ان کی عزتیں محفوظ تھیں۔ عبادت گاہ مسجد

محفوظ تھی۔ بالکل نہیں۔ وہ اذان نہیں دے سکتے تھے۔ مسجدوں کو اصطبل اور بارود خانوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مدرسے تباہ کر دیئے گئے تھے۔ کیا یہ سب کچھ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تھا۔ ہرگز نہیں۔ آپ خود سمجھ لیجیے کہ اگر کسی کے دو دشمن ہوں، ایک خاموش ہو اور دوسرا گھر کو جلا دے۔ گھر میں آگ لگا دے۔ آپ کس کے گلے پڑیں گے۔ خاموش رہنے والے کے "نہیں" یقیناً آپ آگ لگانے والے کو مارنے دوڑیں گے اور اس لڑائی میں اگر آپ کا دوسرا دشمن کچھ معاونت کرے گا، تو آپ دھتکار نہیں سکیں گے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس میں اس کی کوئی چال ہو اور وہ اس تباہی کو اس کی مکمل ہلاکت میں بدلنا چاہتا ہو اور یہ سمجھتا اس شخص کا کام ہے۔ یہی صورت سکھوں کے خلاف جہاد کی تھی اور سرحد کا علاقہ اس لیے منتخب کیا تھا کہ وہاں مسلمان حکومت تھی اور پشت پر بھی افغانستان کی مسلم حکومت تھی۔ اگر ہندوستان میں رہتے ہوئے سکھوں سے جہاد کرتے تو پشت سے انگریز کے حملہ کا بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔

سوم: مصنف کتاب ہذا نے ہر ممکن یہ کوشش کی ہے کہ تحریک مجاہدین کو انگریزوں کا حاشیہ بردار قرار دے۔ جس کی دلیل میں ایک ہی بات کو بار بار مختلف پیرائے میں بیان کر کے مضمون کو طویل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انگریزوں نے مجاہدین کی معاونت کی یا نہیں، یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ درحقیقت انگریز نے یہاں بھی اپنی پالیسی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" اپنائی۔ یہاں اس کی پالیسی دو طرفہ نہیں بلکہ تین طرفہ تھی۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار نہیں، بلکہ تین شکار کیے۔ اول، ہندوستانی مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کیا۔ دوم، سکھوں کے زور کو توڑا۔ اور سوم، یہ کہ افغانوں کی طاقت کا شیرازہ بکھیرا۔ یہ تھی انگریز کی چال، جس میں ہندوستانی مسلمان پہلے بھی پھنسے تھے اور اب کہ پھر اسی دلدل میں دھنستے گئے تھے۔ سرحد کا علاقہ جنگ کے لیے منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایک مسلم حکومت کا قیام عمل میں لا کر جو کہ ان خطوط پر مبنی ہو جن کی نشاندہی شاہ ولی اللہ صاحب نے کی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی داغ بیل ڈالی جائے، مگر جب وہاں حکومت قائم ہو گئی اور وہاں کے امراء نے بیعت و اطاعت قبول کر لی تو پھر انگریز اور سکھوں کی چالوں سے مسلمانوں میں آپس میں ٹھن گئی۔ فرقہ واریت کا بیج بو یا گیا اور اسے خوب ہوا دی گئی اور اس چنگاری سے خوب آگ بھڑکی جو افغانوں کی بغاوت پر منتج ہوئی۔

کوئی اطاعت قبول کرے اور پھر بغاوت کر دے، تو امیر کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کا اندازہ آپ خود کرلیں اور یہ بات بھی مدنظر رکھیں کہ اس وقت ایک حکومت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ رہا معاملہ ان کے خلاف فتویٰ کا تو میں بھی اس کے حق میں نہیں۔ میں صرف تاریخ کی رو سے حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ چہارم، یہ کہ شاہ اسمٰعیل کے بارے میں مصنف نے ہر بات میں صرف ایک ہی دلیل کو ہر رنگ میں پیش کر کے کردار کشی کی کوشش کی ہے اور وہ ہے پٹنہ کا وعظ۔ جاسوسی کا باب ہے یا سیاسی کردار کا' انگریزوں کی کاسہ لیسی کا باب ہے یا سکھوں سے جہاد کا، ہر جگہ صرف اسی ایک دلیل کو بنیاد بنایا گیا ہے جو تاریخ نگاری کے ساتھ ایک مذاق ہے اور پھر مصنف نے حوالہ جات میں ایک ہی مصنف کی دو متضاد آراء کو ایک ہی پیرائے میں بیان کر کے اپنے مضمون کے توازن کو بھی بگاڑ دیا ہے۔

پنجم، مصنف کسی صورت بھی دونوں اصحاب کا موازنہ کرنے میں بالکل ناکام رہا ہے۔ فضل حق خیر آبادی کا تو تھوڑا بہت ذکر ہے، مگر شاہ اسمٰعیل کے بارے میں مصنف نے نہایت تعصب سے کام لیتے ہوتے ہر باب میں ملامت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر کتاب کا ہر باب شاہ اسمٰعیل کے بارے میں نہیں؛ بلکہ سید نذیر حسین، سید احمد دہلوی (؟) اور دوسرے پیروکاروں اور سوانح نگاروں پر تنقید اور ان کے دلائل اور بیانات کو جھٹلانے پر صرف ہوا ہے۔ یہ باب فتویٰ کے بارے میں یا جہاد کے بارے میں، سکھی بیان کے بارے میں ہے یا انگریزوں کے حاشیہ برداروں کے بارے میں، اس میں ذکر صرف اور صرف اور زیادہ تر سید احمد اور دوسرے پیروکاروں کا ہے۔ شاہ اسمٰعیل کا نہیں، بلکہ ہر بات میں مصنف نے دیدہ دانستہ شاہ اسمٰعیل کو ہر کام میں ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے۔ ذکر تو وہ سید احمد کا کرتا ہے، مگر باب کا اختتام شاہ اسمٰعیل پر کر کے ان پر لعن طعن کرتا ہے۔ یہ متعصب رویّہ کسی طور پر تاریخ نگاری کے شایانِ شان نہیں۔

رہا معاملہ سید احمد کی وہابیت کا، تو یہ تاریخی حقیقت ہے کہ سفر حجاز میں وہ ایک عرصہ تک عبدالوہاب کے ساتھ رہے تھے، مگر شاہ اسمٰعیل اور عبدالحئی وغیرہ کسی کی عبدالوہاب سے ملاقات نہیں ہوئی؛

بلکہ یہ دونوں اصحاب شاہ عبدالعزیز کے مرید تھے۔ اگر کوئی ان کو سید احمد کا مرید یا خلیفہ ثابت کرتا ہے، تو یہ اس کی کم عقلی ہے اور اسے حقیقت کو جاننے کے لیے تاریخ کی ورق گردانی کرنی چاہیئے نہ کہ آٹھ دس کتابیں سامنے رکھ کر کسی کی کردارکشی کی خاطر اس میں سے حوالہ جات نقل کر کے کتاب لکھ ڈالے۔

پروفیسر میاں مقبول احمد

گورنمنٹ انٹر کالج، راوی روڈ۔ لاہور

تحریک آزادی کے علمبرداروں کی انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کا احاطہ کرنا کوئی آسان کام نہیں اور پھر ان کا تقابلی جائزہ تو اور بھی مشکل ہے جس کے لیے تاریخی واقعات اور سیاسی حالات کا گہرا مطالعہ اور شعور درکار ہے۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ داعیانِ آزادی کی شخصیتیں ہمیشہ متنازعہ رہی ہیں۔ اپنے حواریوں کی نظر میں ان کا کردار فرشتوں سے برتر ہے، جبکہ مخالفین کے نزدیک ان کا ہر فعل شک و شبہ کی نگاہ میں دیکھا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عقیدہ کی وابستگی ہے۔ عقائد اور مسلک سے بالاتر ہو کر اگر تاریخی حقائق اور سیاسی شواہد پر مکمل غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے، تو حسن و قبح کی ایک متوازن صورت پیش کی جا سکتی ہے۔

راجا غلام محمد صاحب نے "امتیاز حق" میں اسی متنازعہ فیہ مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے اور وہ اپنے انداز میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے حالات و واقعات پر حوالوں کی روشنی میں تبصرہ کرتے ہوئے قارئین کے اذہان میں حقائق کو نقش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے ——————— اگر عقیدت کی گہری چھاپ سے کہیں کہیں لہجہ کی درشتی کا بھی احساس ضرور ہوتا ہے۔ تاریخ نویسی کا زریں اصول "غیر جانبداری" اس وقت پیش نظر ہے۔ موازنہ اور مقابلہ کرتے وقت بے لاگ تبصرہ ضروری ہوتا ہے۔ ایک ہم مشرب، ہم مسلک اور ہمنوا کے لیے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، لیکن ایک مبتدی اور

غیر جانبدار قاری کے لیے یہ بے حد ضروری ہوتا ہے۔ راجا صاحب نے اعتراضات کے ابطال میں زورِ قلم صرف کر دیا ہے اور بمصداق "از ماست کہ بر ماست" خود مخالفین کی نگارشات سے بڑی کامیابی کے ساتھ ان کے اعتراضات کا رد پیش کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ منطقی انداز میں اعتراضات بھی اٹھائے ہیں، لیکن انہوں نے کہیں موضوعِ سخن شخصیتوں کے جذبۂ آزادی کا اعتراف نہیں کیا۔ ان کے طریق کار سے لاکھ اختلاف سہی، مگر بنیادی جذبۂ آزادی تو کم از کم قدر و استحسان کی نظر سے دیکھا جانا ضروری ہے۔ میرے خیال میں اگر تحریکِ مجاہدین کو انگریزوں کی مسلّمہ پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے پس منظر میں دیکھا جائے، تو باہمی منافرت کی اصل وجہ واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے جو وہ اپنی بقائے حکومت کے لیے بہر نوع زیرِ عمل لاتے تھے۔ مجاہدین نہ تو انگریزوں کے حاشیہ بردار تھے اور نہ ہی سکھوں کو اپنا خیر خواہ یا معاون سمجھتے تھے۔ انہوں نے تحریک چلائی، آزادی کا نعرہ بلند کیا، تنظیم کی داغ بیل ڈالی، قوم میں آزادی کا جذبہ ابھارا، بے بضاعتی کے عالم میں نامساعد حالات کا سامنا کیا۔ اپنے ساتھیوں اور بعد میں آنے والے حریت پسندوں کے لیے راہِ عمل و جہاد کو ہموار کیا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی بساط اور دانست کے مطابق شجرِ آزادی کا بیج بویا اور اس کی آبیاری کی کسی نے کم کسی نے زیادہ۔ ہر ایک کا حصہ بقدرِ ہمت اوست تسلیم کرنا حقیقت پسندی کا تقاضا ہے۔ کسی کی کوششوں اور کاوشوں کو یکسر نظر انداز کر دینا انصاف کے سراسر منافی ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے دو چیزیں لازم ہوتی ہیں، ایک جذبہ اور دوسرا عمل۔ جذبہ بنیادی چیز ہے اور عمل اختیاری، جذبے کی صداقت سے انکار ناممکن ہوتا ہے، البتہ عمل میں خامیاں، کوتاہیاں اور بے اعتدالیاں ہدفِ تنقید قرار دی جا سکتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں حالات و واقعات کی کسوٹی پر ضرور پرکھا جائے تاکہ کردار کشی کا شائبہ نہ ہو۔

جذبات و عواطف اور عقائد کی دل بستگی کے باوجود ایک پاکستانی کو کسی نوع اس حقیقت سے مفر نہیں کہ دینی رہنماؤں ملّت کے اکابرین، سیاسی لیڈروں، مفکرین، مجاہدین، ادباء اور شعراء سب نے مل کر اپنی استطاعت کے مطابق تحریکِ آزادی کو پروان چڑھایا اور تعمیرِ پاکستان میں مقدور بھر کوشش کی۔ آج ہم ایک خود مختار اور اسلامی مملکت میں آزادی کا جو سانس لے رہے ہیں، وہ ہمارے

حب بزرگوں کی مساعیٔ جمیلہ کا ثمر شیریں ہے۔ اکابرین کی حرف گیری ہمیں زیب نہیں دیتی۔ ان کے باہمی سیاسی اختلاف سے بھی ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ان سب نے جیسے بھی بن پڑا، انہوں نے ہمیں پاکستان لے دیا۔ اب مادرِ وطن کی عزت و ناموس اور بقاء و استحکام کی خاطر ہمیں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

جناب بزمی انصاری

۸۷ اے۔ بلاک این۔ نارتھ ناظم آباد کراچی ۳۳

"امتیاز حق" نامی کتاب کا لب ولہجہ کہیں کہیں تصنیف و تالیف کے مسلمہ ضوابط کے خلاف تلخ اور درشت ہو گیا ہے۔ نیز یہ کتاب فرقہ وارانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ میں طبعاً صلح جو اور امن پسند آدمی ہوں، خواہ مخواہ کسی متنازعہ معاملے میں اپنے آپ کو ملوث کرنا نہیں چاہتا، لہٰذا میں ایسی کتاب پر تبصرہ کرنے سے معذور ہوں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

ایڈیٹر "نگار" پاکستان، کراچی

"امتیاز حق" میری نظر سے پہلی کتاب گزری، جس میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی اصل کیفیت تاریخی حقائق کی روشنی میں سامنے لائی گئی۔ اس سے پہلے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کی مختصر سی کتاب دیکھی اور آنکھیں روشن کی تھیں، لیکن "امتیاز حق" نے دل و دماغ دونوں کو مسخر کر لیا۔ راجا غلام محمد صاحب نے ایک نئے اور دونوں موضوع پر جس پر عالمانہ اور محققانہ انداز سے گفتگو کی ہے، وہ ان کی تاریخی بصیرت

اور وسعتِ مطالعہ پر دلالت کرتا ہے۔ عموماً ایسے موضوعات پر ہمارے مؤرخ اور صاحب الرائے اہل قلم تک جذباتی اور جانبدارانہ لب ولہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لہجہ اُن کی تنگ نظری اور کم علمی پر مبنی ہوتا ہے، لیکن مجھے راجا صاحب کے قلم میں ایسا اعتدال و توازن نظر آیا کہ ان کے علم و فضل کا قائل ہونا پڑا۔

"مولانا فضلِ حق خیر آبادی" کی شخصیت کو ہمارے مؤرخین نے کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، اس کا مجھے پورا اندازہ "امتیازِ حق" کے مطالعہ سے ہوا۔ راجا صاحب نے بڑی خوبصورتی اور قوت کے ساتھ ان کے مخالفین کو جواب دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد سید احمد بریلوی کے بارے میں میرا نقطۂ نظر بدل گیا اور میں خود کو مجبور پاتا ہوں کہ ان کے معرکوں اور جہادِ فی سبیل اللہ پر از سرِ نو نگاہ ڈالوں۔ ہوا یہ کہ پچھلے پچیس تیس برسوں میں آزادی کے حوالے سے سید احمد اور ان کی تحریک کے بارے میں بےشمار کتب و مقالات لکھے گئے، ان میں سے بیشتر میں یہ کوشش کی گئی کہ انہیں حلقۂ دیوبند سے منسلک کر کے جنگِ آزادی کا سب سے بڑا مجاہد ثابت کیا۔ اس کوشش میں حقائق پر ایسے دبیز پردے ڈالے گئے کہ پردہ کے سوا اور کچھ سامنے نہ رہا۔ ایسے میں عام پڑھے لکھے طبقے کا سید احمد کو مجاہدِ اعظم سمجھ لینا اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے بدگمان ہو جانا حیرت انگیز نہ تھا۔ راجا صاحب کی کتاب اگرچہ صرف سوا سو[۱۲۵] صفحات پر مشتمل ہے، لیکن انہوں نے جس حسن و خوبی سے محاکمہ کیا ہے اور فضلِ حق خیر آبادی و سید احمد کے کرداروں کا فرق واضح کیا ہے، وہ اسے ایک جامع کتاب کی حیثیت دے دیتا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو لمبے لمبے اقتباسات کے ذریعہ کتاب کو ضخیم بنا دیتا۔ راجا صاحب نے اصل موضوع کو ہمہ وقت سامنے رکھا ہے اور جس طرح ایک اچھا وکیل، صرف ضروری باتیں، منصفین کے سامنے پیش کرتا ہے اور جج کو لفاظی کے بجائے دلائل اور حقائق کے ذریعہ انصاف کی طرف راجع کرتا ہے، بالکل اسی طرح اس کتاب میں صرف کام کی باتیں ہی کہی گئی ہیں۔ نہ لفاظی ہے نہ انشاء پردازی، نہ طویل اقتباسات ہیں، نہ لمبے لمبے حوالے، صرف شہادتیں اور اسناد ہیں، وہ بھی مختصر اور برمحل، نتیجتاً، بات کی تہ تک پہنچنا مشکل نہیں رہ جاتا اور کتاب کا قاری پوری دیانت کے ساتھ مصنف کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک اس کتاب کے جواب میں کوئی اور کتاب سامنے نہیں آتی اُسے اپنے موضوع پر حرفِ آخر ہی سمجھا جائے گا اور اس کا قاری، سید احمد کے بجائے مولانا فضلِ حق خیر آبادی کو اصل مجاہد سمجھے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

پرنسپل گورنمنٹ سائنس کالج سکرنڈ، نواب شاہ (سندھ)

"امتیازِ حق" اسم بامسمیٰ ہے۔ اس کتاب میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کے کردار کا حقائق و واقعات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے اور تاریخ کے مخفی گوشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ہمارے بعض مورخوں نے تاریخی حقائق کو عقیدے کی عینک سے دیکھا اور ایک طرف جھک گئے اور دوسری سمت کو یکسر نظرانداز کر دیا، یہی نہیں بلکہ ایسی خاک اڑائی کہ دوسری سمت نظر نہ آئی، سفید کو سیاہ بتایا اور کھرے کو کھوٹا کر دکھایا، اس طرح پوری قوم کو دھوکہ دیا۔ یہ ایک قومی سانحہ ہے اور عظیم المیہ۔ یہ وہ رونا ہے کہ شماتتِ ہمسایہ کے خوف سے اس کا زیادہ چرچا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے مؤرخوں کی ایک طرف یہ کرم فرمائی کہ مشکوک شہادت کو محبوب و مبرور بنایا اور دوسری طرف یہ قہر انگیزی کہ محبوب و مبرور شہادت، مردود۔ پاکستان کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اسی قسم کی تہی سامانیوں کے پیش نظر کھلے دل سے یہ اعتراف فرمایا کہ تحریک جہاد کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، سب یک طرفہ ہے۔ ہم کو فاضل مؤلف راجا غلام محمد صاحب زید مجدہٗ کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے دوسری طرف بھی توجہ فرمائی اور نتائج کی بنیاد حقیقتوں پر رکھی، افسانوں پر نہیں۔

مؤلف کا طرزِ استدلال نہایت پختہ اور طرزِ تحریر نہایت شگفتہ ہے۔ اشعار ایسے برمحل اور برجستہ جیسے اس موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ کے طالب علم تو اس سے محظوظ ہوں گے ہی، مگر ادب کے طالب علم بھی محظوظ ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ طعن و طنز کو میں تو نفسِ اچھا نہیں سمجھتا، کیونکہ ان کی تلخی و ترشی تحریر کو بدمزہ اور مقصد کو مجروح کر دیتی ہے، مگر فاضل مؤلف کا

یہ کمالِ بیان ہے کہ ان کے تیر و نشتر ایسے دل آویز و دل پذیر ہیں کہ شاید مقتول و مجروح بھی داد دیئے بغیر نہ رہے۔

"امتیازِ حق" کے مطالعہ سے ان حضرات کے فکر و خیال میں تبدیلی مشکل معلوم ہوتی ہے، جنہوں نے تاریخی حقائق کو عقائد کا درجہ دے رکھا ہے اور تاریخ کی رُوح ہی سے یکسر نابلد ہیں، البتہ ان حضرات میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے جو تاریخ کو عقائد کی نہیں حقائق کی روشنی میں پڑھنا چاہتے ہیں اور یہ تبدیلی آنی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ابھی ہم نے جوہرِ عقل کو برباد نہیں کیا اور ہزار سرمستی و سرشاری کے باوجود عقل کی بات سننے کے لیے تیار ہیں۔

اللہ تعالیٰ فاضل مؤلف محترم راجا غلام محمد صاحب زید مجدہ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے تاریخی حقائق کو واشگاف بیان کیا اور حسنِ بیان سے جمالِ حق کی لاج رکھ لی۔ اُمید ہے کہ ان کی یہ کتاب حق پسندوں میں مقبول و محبوب ہوگی۔ ناشر بھی مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے فرزندانِ اسلام کو سچی تاریخ سے روشناس کرایا، آنکھوں سے پردہ ہٹایا اور دل و دماغ کو روشن کیا۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کا اجرِ عظیم عطا فرمائے اور اس کتاب کو چراغِ ہدایت بنائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم)

ماہنامہ "فیضان" لاہور - جون ۱۹۷۹ء)

پروفیسر سید محمد عارف

گورنمنٹ کالج - بہاول پور

ہر زمانے میں مذہب و مسلک کے تعصبات کے پیشِ نظر مؤرخین نے تاریخی بددیانتیوں کا ارتکاب کیا ہے، لیکن زمانہ بقولِ اقبالؒ "صیرفیِ کائنات ہے ـــ کھرا کھوٹا الگ کر دیتا ہے"

کتاب "امتیازِ حق" کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا، جوں جوں اس کے اوراق پلٹتا تھا،

حیرت و استعجاب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ سید احمد بریلوی اور اسماعیل شہید کے بارے میں میرے اپنے مطالعے کے پیدا شدہ مسلمات ٹوٹتے جاتے تھے ــــ دراصل مذکورہ بزرگوں کے عقیدتمند مؤرخین" نے ان کی جو تصویر کشی کی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے، حالانکہ واقعات کو غیر جانبداری سے دیکھا جائے، تو مصنف کے دلائل بڑے وزنی معلوم ہوتے ہیں کہ درحقیقت معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے معروف "جہاد" میں انگریزی حکام کی اعانت ہر قدم پر شامل حال رہی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ گئے تھے سکھوں سے جہاد کرنے، لیکن سرحدی مسلمانوں سے جا بھڑے، کیونکہ ان کی نظر میں وہ بھی بدعتی تھے، مشرک تھے، لہٰذا قابل گردن زدنی تھے، حالانکہ اس طرزِ عمل سے مسلمانوں کی اس اجتماعی قوت پر ضرب کاری لگی جسے انگریزوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔

مجھے مرحومین سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے، لیکن اتنا انصاف تو ضرور ہونا چاہیے کہ تاریخ میں جو شخصیت جس مقام کی مستحق ہے، اسے وہی مقام دیا جائے ــــ یہ مسلکی تعصب کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے کہ فضل حق خیرآبادی، جن کی خدمات جہادِ آزادی میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں کو پس پشت ڈال دیا گیا اور وہ لوگ جن کی کوششیں کسی اور رُخ پر ہوتی رہیں، ان کی عظمت کو بڑھانے کے لیے اس قدر جھوٹ بولا گیا کہ وہ سچ معلوم ہونے لگا اور ثقہ لوگوں کی غلط نمائی نے حقائق کو اس قدر مسخ کیا کہ مسلمان پٹھانوں کے خلاف ان معرکوں کو تحریکِ پاکستان کی بنیاد قرار دیا جانے لگا ؏

ناطقہ سربگریباں ہے، اسے کیا کہیے

نام نہاد محققین و مؤرخینِ اسلام نے سید احمد بریلوی و اسماعیل شہید کی سیرت و سوانح پر بڑی شد و مد سے قلم اٹھایا، لیکن فضلِ حق خیرآبادی کے سلسلے میں ان کا وہی رویّہ ہے ؏

مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مصنف کتاب ہذا نے بڑی تحقیق اور بڑے سلیقے سے ان ہی کے اکابر کے حوالوں سے ناانصافیوں کے ازالے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جناب محمد اسرائیل

سابق مترجم السنۂ شرقیہ، پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی

کتاب میں نے اوّل سے آخر تک غور و خوض کے ساتھ حرفاً حرفاً اور کئی بار پڑھی حقیقت یہ ہے کہ محترم راجا صاحب زید مجدہٗ نے مواد جمع کرنے، سلیقہ مندی اور خوش اسلوبی سے ترتیب دینے، مناسب مقصد برجستہ اشعار کیا موتی پرونے میں بڑی جانفشانی، محنتِ شاقہ اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور کمال یہ ہے کہ "امتیازِ حق" و باطل کے لیے سارے حوالے ان لوگوں کی کتابوں سے لیے ہیں، جو ناحق استاذ الاساتذہ علامہ فضلِ حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے عمل صالح کو فضا میں بکھیرنے اور ان کے روشن کردہ چراغ کو حسد کے پھونکوں سے بجھانے کی ہمہ گیر کوشش کرتے ہیں۔ یہ طرزِ تحریر اتنی سادہ، رواں اور منصفانہ ہے کہ ساری کتاب میں ان لوگوں کے برعکس تحقیر یا تنقیص کا شائبہ تک نہیں۔ غرضیکہ محترم راجا صاحب کی اس کاوش اور سعیٔ بلیغ کے لیے راقم کیا سلسلہ عالیہ خیرآبادیہ کے تمام متوسلین تہِ دل سے شکر گزار رہیں گے۔

حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب کے دہلی سے نکلنے یا نکالنے اور تحریک مجاہدین کے متعلق میں دو ہمعصر حضرات کی کتابوں سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں اور آخر میں بزرگوں سے اپنی سُنی ہوئی اور کچھ دیکھی ہوئی باتیں عرض کروں گا، جن سے "امتیازِ حق" کی مزید تائید ہوتی ہے۔

(۱) مولانا ابو محمد قلندر علی الزبیری الاسدی پانی پتی اپنی کتاب "تنزیل التنظیر فی نظیر البشیر والنذیر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اور بلاشک مولوی اسمٰعیل دہلوی حافظِ قرآن اور عالم باعمل تھا، لیکن متھادہ جھگڑا کرنے والا اپنے اکابر معاصرین سے اور شدت کرنے والا عارفین کے خلفاء پر، اُن سے اس واسطے عداوت تھی

کہ امراء و سلاطین ان خلفاء و عرفاء کو عطیاتِ کثیرہ دیتے تھے، اس کو اس قدر نہ دیتے تھے، پس حسد ہوا اس کو اور اپنے وعظ میں بُرا کہنا ان کو شروع کیا، حتیٰ کہ استعانت باولیاء و کرامات عرفاء سے بھی انکار کیا اور اختیار کیا مذہب عبدالوہاب ناصبی نجدی کا، جس کی مذمت حدیث بخاری سے واضح ہے پس اُس کے زمانہ کے علماء و فضلاء نے اس کو بُرا کہا اور بُرا جانا اور اس سے مباحثہ کیا۔ آخرالامر مباحثہ منجر بدشمنی ہوا اور اس کی تکفیر کی اور حاکم کے حکم سے دہلی سے خارج کر دیا۔" (ترجمہ)

اس عبارت سے اسمٰعیل صاحب کے کردار پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ مؤلف اسی عہد کے چشم دید گواہ ہیں۔

(۲) شمس العلماء قاضی میر احمد شاہ صاحب رضوانی اپنی کتاب "بہارستانِ افغانی" (پشتو) میں "سید باچا" اور شاہ اسمٰعیل کے متعلق لکھتے ہیں،

"پختونوں کے ملک کے مشہور واقعات میں سے ایک، واقعہ "سید باچا" کا ہے جو ستر سال قبل پشاور اور یاغستان کے علاقوں میں پیش آیا تھا، جس میں بہت سے مسلمان، پٹھان، درانی، علماء اور سردار ناحق ضائع اور قتل ہوئے اور سینکڑوں دیہات برباد ہو گئے۔ یہ فتنہ اس سرزمین میں صرف چار سال تک برپا رہا، لیکن چنگیز، ہلاکو اور نادر کی تباہیوں سے زیادہ ملک کو نقصان پہنچایا اور صرف دنیاوی نقصان نہیں، بلکہ لوگوں کے عقائد بھی خراب کر دیئے۔" (ترجمہ)

ص ۶۱ و ۶۲ پر لکھتے ہیں،

"مولوی اسمٰعیل جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاگرد بھی تھے اور بہت ذکی آدمی تھے، اپنی بدعقیدگی کے سبب کہ فقہ نہیں مانتے تھے اور تقلید کے منکر تھے، دہلی میں اس کا گزران نہیں ہو سکتا تھا بادشاہ اس سے ناراض تھا۔ جامع مسجد میں کوئی نماز پڑھنے نہیں دیتا تھا۔ مولوی فضل حق خیر آبادی جو اس وقت کے بڑے فاضل اور علامہ تھے اور ریذیڈنٹ صاحب دہلی اور بہادر شاہ، بادشاہ دہلی کے بڑے دوست تھے۔ مولوی ان کا دشمن ہو گیا، کیونکہ وہ تمام مقلدین کو بدعتی کہتا تھا۔ انہیں اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے سہارا درکار تھا، اس لیے سید سے جا ملا اور اس کا مرید بن گیا (ترجمہ)

ص۶۵ پر لکھتے ہیں :

" اسی سال (۱۲۴۲ھ) کو پنجتار کے مقام پر ہندوستانیوں کے بہت سے قافلے رامپور، دہلی اور عظیم آباد سے کثیر سامانِ رسد کے ساتھ پہنچ گئے، مگر ان میں سے محبوب علی دہلوی سید کے کردار سے بڑا ناراض ہو گیا اور ان پر بڑے اعتراضات کیے کہ آپ کی امامت اور جہاد قطعاً صحیح نہیں ہے۔ آپ بیت المال کی رقم بے جا خرچ کرتے ہیں۔ بہت سارے لوگوں کو ناحق اکٹھا کیا ہے۔ ساتھ ہی غازیوں کو بُرا بھلا کہا کہ جاؤ تم یہاں کس لیے بیٹھے ہو؟ تم پر ماں باپ، اولاد اور بیویوں کا حق ہے، یہاں کیا کرتے ہو؟ رات دن پکانے کھانے میں لگے رہتے ہو، کونسے کافر سے تم نے جہاد کیا؟ تمہارا دین و دنیا دونوں خراب ہیں۔ اور پھر سید سے کہا کہ آپ کا مطلب سرداری اور حکومت ہے، سرے سے آپ کی امامت ہی ناجائز ہے۔" اس پر بہت سے غازی پراگندہ ہو گئے اور مولوی محبوب علی جو سید کے خاص مریدتھے بہت سارے لوگوں کے ساتھ ہندوستان واپس چلے گئے اور ہندوستان کی مدد بند کی۔" (ترجمہ)

ص۷۰ پر لکھتے ہیں :

" سید کا دباؤ جب بڑھ گیا، تو اس نے سمہ (علاقہ یوسف زئی) کے تمام خوانین اور سربرآوردہ لوگوں کو بُلایا اور اُن سے کہا کہ بغیر کچھ لیے دیئے کنواری لڑکیوں اور بیواؤں کی شادیاں کراؤ، چنانچہ ہزاروں کنواریاں بیاہ دی گئیں، اس لیے پٹھان اس بدناموسی (بے عزتی) پر بیحد خفہ ہو گئے۔" (ترجمہ)

ص۷۵ پر لکھتے ہیں :

" سید بذاتِ خود دلیر اور اچھے آدمی تھے اور عقیدہ بھی اُس کا کچھ بُرا نہ تھا، لیکن اس کی سادگی اور مولوی اسمٰعیل کی آزادی اور غیر مقلدی اور خودسری بیشمار خلق اللہ کی خرابی اور بربادی کا سبب بنی۔ مولوی اسمٰعیل وہ پہلا آدمی تھا جس نے اپنے بزرگوں اور استادوں کے برخلاف وہابیت کی بنیاد رکھی اور سید سے کہا آپ مثل محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور میں (اسمٰعیل صاحب) مثل ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) ہوں اور تمام دنیا کے ان مسلمانوں کو بدعتی کہتا تھا جو فقہ پر عمل پیرا تھے۔ انہی بدعتی لوگوں کو قتل کرنے کی غرض سے سید کو امام بنایا۔ علماء پر کفر کے فتوے لگاتے اور انہیں قتل کرتے مولانا عبدالعزیز

جوان کے استاذ اور سید کے پیر تھے، انہوں نے کبھی ایسے کام نہیں کیے تھے۔"

میری دید و شنید :

آج (۱۹۷۹ء) سے چھپن سال قبل کی بات ہے کہ میں پہلی بار اپنے گاؤں سے نکل کر اپنے تایازاد بھائی کے ساتھ تانگے میں مردان جا رہا تھا جس میں اگلی سیٹ پر دو معمر ترین بزرگ بیٹھے ہوئے تھے اسلامی حکومت کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

اس زمانے میں افغانستان کی حکومت سے لوگوں نے امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ ہجرت کا واقعہ تازہ تھا۔ ایک اسلامی حکومت کے حق میں تھا۔ دوسرے نے کہا: کونسی اسلامی حکومت اور شریعت؟ وہی جو ہندوستانی لائے تھے اور اپنے دورِ امارت میں بلا اجازت ہمارے گھروں میں گھس کر ہماری جوان بیٹیوں اور بہوؤں سے زبردستی اپنے بالوں سے جوئیں نکلواتے تھے اور ہم دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے، ایسی شریعت سے انگریز کافر کی حکومت ہزار درجے اچھی ہے۔"

یہ گفتگو میں نے اپنے کانوں سے سُنی ہے۔ اس وقت اگرچہ ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگیں، مگر بڑے ہو کر اپنے بزرگوں اور دوسرے معتمدین سے حالات معلوم کرنے پر اس کی صداقت پر یقین آ گیا (راقم کا گاؤں پنجتار کے قریب واقع ہے)

اور دیدنی یہ ہے :

ہمارے بچپن کے زمانے میں اکثر مجاہدین انگریزوں کے لیے مخبری کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دو ہندوستانیوں کو دیکھا تھا جو اس کام پر مامور تھے۔ لوگ انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آخر کار گیا، کھبل (جو ٹوپی سے کچھ فاصلے پر دریائے سندھ کے کنارے آباد تھے اور اب تربیلہ جھیل کی وجہ سے زیر آب آ گئے ہیں) میں لوگوں نے انہیں دریا میں پھینک دیا۔ افسوس کہ میں ان کے نام بھول گیا۔

علاوہ ازیں یہ بھی مصدقہ بات ہے کہ یہ لوگ عامۃ المسلمین کے مال و متاع کو اپنے لیے حلال سمجھتے تھے، اس لیے زبردستی ریوڑ ہنکا کر لے جاتے تھے اور اپنے کام میں لاتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں (او

اب بھی، سرحد اور افغانستان کے باشندے سب کے سب پکے حنفی المذہب، اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے اور اسمٰعیل صاحب انہیں مذہب سے آزادی دلانا چاہتے تھے، حالانکہ وہ اس کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ مخالفت بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ تمام علاقے کے لوگوں نے جرگہ کرکے فیصلہ کیا کہ کڑہ مار نامی پہاڑ پر جب آگ روشن ہوتے دیکھی جائے، تو جہاں جہاں یہ لوگ موجود ہوں، انہیں قتل کیا جائے۔ افسوس کہ ایسا ہی ہوا اور یہ مسافر اپنے وطن سے دُور بڑے کس مپرسی کی حالت میں مارے گئے، تہ تیغ کیے گئے، کنوؤں میں ڈال دیئے گئے۔ کوئی انہیں امان دینے والا نہیں تھا، سکھوں کا زور نہ ٹوٹ سکا اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔

ان دردناک واقعات کے بعد پھر اسی خادی خان کے فرزند خان مقرب خاں کی سرکردگی میں علاقے کے لوگوں نے بالاتفاق سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور چند ہی دنوں میں یوسف زیئوں کا علاقہ پاک کر دیا۔ اس جہاد میں شریک چند ایک بزرگوں کے ساتھ مجھے ملاقات نصیب ہوئی ہے، جو غیبی امداد کے عجیب و غریب قصے بیان کرتے تھے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات اس لیے نقل کیے گئے کہ یہ بات اور بھی عیاں ہو جائے کہ محترم راجا صاحب نے "امتیاز حق" میں جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ بالکل سیدھا سادہ اور موصل الی المطلوب ہے اور اس کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ حضرت اسمٰعیل صاحب اور حضرت سید احمد صاحب اور ان کے متبعین نے سکھوں سے کم اور سرحدی مسلمانوں کے ساتھ زیادہ جہاد کیا ہے اور انگریزوں کے ساتھ جہاد کرنے کا تو ان دونوں حضرات کی تاریخ میں کہیں ذکر تک نہیں، دونوں سکھوں یا مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

ان کے مقابلے میں حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ بقولِ حدو منطقی اور فلسفی سہی، لیکن جرأتِ ایمانی دیکھئے کہ کافر انگریز کے تسلط کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور جس کا انجام بھی نہیں معلوم تھا کہ سزائے موت ہے یا عبور دریائے شور، کسی مسلمان کے خلاف نہ فتویٰ دیا، نہ کسی کو قتل کرایا، صرف مسلمانوں کی آزادی اور اسلامی حکومت کی بقا کے لیے اپنا سر، اپنا جاہ و منصب، اپنا مال و منال قربان کیا جس کی سزا میں جزائر انڈمان بھیجے گئے اور وہیں شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے آمین!

پروفیسر سید سبطِ حسن فاضل زیدی

گورنمنٹ کالج، سکرنڈ، ضلع نواب شاہ (سندھ)

"امتیازِ حق" امتیازِ حق و باطل کا مقیاس ہے۔ راجا غلام محمد صاحب نے سعیٔ بلیغ فرما کر یہ ایک کسوٹی بنادی ہے جس پر کھوٹے کھرے کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی جن کے ناموں کے ساتھ "شہید" کا لفظ ایک تہمت ہے۔ ان کو ان کے صحیح خدوخال میں پیش کیا گیا ہے اور یہ حقیقت ناقابلِ تردید شواہد کی روشنی میں پیش کی گئی ہے کہ اسمٰعیل دہلوی اور ان کے پیر سید احمد بریلوی انگریزوں کے ساختہ و پرداختہ تھے اور ان کا سکھوں سے جہاد ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تھا۔ دراصل وہ سکھوں سے لڑائی انگریزوں کے اشاروں پر کر رہے تھے اور ان کا مقصدِ وحید سکھوں کی طاقت کو کمزور کرنا اور سرحد کے کٹر مسلمانوں کو کفر کے فتوے صادر کرنا تھا۔ انگریزوں کو سکھوں اور پٹھانوں ہی سے خطرہ تھا۔ دونوں کا استحصال وہ اس ترکیب سے کرنا چاہتے تھے، چنانچہ سید احمد بریلوی، اسمٰعیل دہلوی اور ان کے ساتھی سکھوں سے اُلجھے اور پٹھانوں پر تابڑ توڑ کفر کے فتوے لگاتے اور بالآخر سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

راجا غلام محمد صاحب کی تحقیقِ انیق سے یہ بات پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی ہے کہ غلام رسول مہر (مرحوم) اور پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے افاضل بھی کتمانِ حقیقت کرتے رہے ہیں ——— اور درست حوالوں کو نظر انداز کرتے رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ دونوں فاضل بزرگ وہابی مسلک کے پیرو ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر تو مسلمہ وہابی تھے اور ایوب قادری صاحب پر ان کے بھائی ابو معاویہ نعمت اللہ قادری صاحب کا گہرا اثر ہے اور وہ تردیدِ عقائدِ جماعتِ اہلِ سنت میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور کتمانِ حقیقت کرتے رہے ہیں

مجاہدِ جلیل مولانا فضل حق خیر آبادی تردید عقائدِ وہابیہ میں بہت ہی پیش پیش تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی بھی وہابیوں کی تردید میں لکھوائی تھی۔ مولانا مرحوم کو وہابی مستفین نے بالکل نظر انداز کر دیا اور ان کے مجاہدانہ کارناموں اور ۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی میں ان کی سعیٔ بلیغ کو بہ یک جنبشِ قلم نظر انداز کر دیا اور ان کا نام مجاہدوں کی فہرست ہی سے خارج کر دیا۔ مولانا غلام رسول مہر اور پروفیسر ایوب قادری صاحب نے بھی اس کارنامہ میں حصہ لیا ہے۔ راجا غلام محمد صاحب، نے مولانا فضل حق خیر آبادی صاحب پر تحقیق کا حق ادا کر دیا اور ان کی صحیح تصویر پیش کر دی ہے۔ یہ کارنامہ بھلائے جانے کے قابل نہیں ہے۔

حکیم محمد نصیر الدین ندوی
نظامی دواخانہ۔ شاہراہِ لیاقت، کراچی

چند دن قبل مخدوم زادۂ آفاق حضرت مولانا حکیم سید محمود میاں صاحب برکاتی نے مجھے ازراہِ کرم آپ کی ایک تصنیفِ لطیف "امتیازِ حق" عطا فرمائی۔ موضوعِ کتاب کی دل کشی نے مجھے کلیتاً اپنے اندر جذب کر لیا اور میں کئی دن تک اس بحرِ لذّت میں غرق رہا۔ کتاب کیا ہے، ادب و شعر و انشاء کا ایک دریائے متلاطم ہے۔ آپ کے قلم حقیقت رقم سے جو بات بھی نکلی ہے، وہ میزانِ عدل و انصاف پر بالکل درست ہے۔ حریفِ معاند کی اور اس کے ہم مشرب و مسلک اصحاب کی جانب سے مسلسل یک صد سالہ دشنام طرازیوں، یاوہ گوئیوں، کذب بیانیوں اور گوناگوں دل آزاریوں کے باوجود کیا مجال ہے کہ آپ کی زبانِ قلم سے کوئی ایک جملہ بھی ایسا نکلا ہو جس میں ادنیٰ شائبہ دل آزاری کا ہو۔ آپ نے حقائق کا انکشاف ناقابلِ انکار دلائل سے فرمایا ہے اور ایسے تاریخی شواہد فراہم کر دیئے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی ان حقائق سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اسماعیل دہلوی کا سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ وہ عبدالوہاب نجدی کی اتباع میں اپنے انگریز آقاؤں کی خوشنودی کے لیے "امکانِ نظیر" کا قائل ہوگیا اور اپنے باطل [illegible] میں حضرت رب العزت کی عدمِ قدرت کے اثبات کے درپے ہوگیا، حالانکہ حضرت رسالت فداہ ابی و اُمی کا نظیر ممتنعات میں سے ہے اور ممتنعات پر قدرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کلامِ پاک میں متعدد مقامات پر حضرت حق جل مجدہٗ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی پر رسالت ختم کر دی گئی ہے اس بے بصیرت کو اتنا بھی نظر نہیں آتا کہ امکانِ نظیر کا قائل ہونے کی صورت میں "خلفِ وعید" لازم آتا ہے غرض یہ ہے کہ اس ظالم کے اس اقدام سے بابِ نبوت وا ہوگیا اور انگریز نے غلام احمد قادیانی کو نبی بنا کر کھڑا کر دیا اور مسلم قوم کے شیرازے کو منتشر کر دیا ہے۔ عہدِ برطانیہ سے پہلے مدعیانِ نبوت کی سزا قتل تھی، مگر غلام احمد قادیانی کو تو انگریز کی نصرت و حمایت حاصل تھی، اس لیے یہ فتنہ آج تک مسلم قوم کے جسدِ ملی میں ناسور کی طرح موجود ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حضرت علامہ فضلِ حق خیر آبادی کی کتاب مستطاب "امتناع النظیر" کا سہل و آسان ترجمہ کر کے ملک میں عام کر دیا جائے تاکہ دنیا میں ایسا فتنہ کبھی سر ہی نہ اٹھا سکے۔ حضرت علامہ مرحوم نے اس کتاب میں ایسے عقلی و نقلی دلائل جمع کر دیئے ہیں کہ عالم میں کوئی غبی سے غبی انسان بھی امکانِ نظیر کا قائل نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب، دراصل علامہ مرحوم کی ذہانت و طباعی پر ایک روشن دلیل بھی ہے اور حضرت سرکارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے علامہ مرحوم کی کمالِ وابستگی و غایتِ عقیدت و شیفتگی کا بیّن ثبوت بھی — اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں اسماعیل دہلوی کی گستاخیوں پر علامہ مرحوم کے قلم میں انتہائی شدت، و تلخی بھی آگئی ہے۔ یہ کتاب حضرت علامہ مرحوم نے دراصل اپنے تلمیذ رشید مولانا ہدایت اللہ جونپوری کے نام سے ارقام فرمائی تھی۔ مولانا ہدایت اللہ صاحب کی دیانت اس امر کی متقاضی نہیں ہوئی کہ وہ حضرت علامہ کی کتاب اپنی ذات سے منسوب کر لیں، اس لیے انہوں نے اپنے شاگرد رشید مولانا سلیمان اشرف بہاری کے اصرار پر مصنف کا اصل مسودہ ہی مولانا سلیمان اشرف کے حوالے کر دیا۔ یہ جملہ باتیں مجھے مولانا سلیمان اشرف مرحوم ہی سے معلوم ہوئی ہیں۔

آپ کے دماغ میں ذخیرۂ اشعار بھی معیاری ہے۔ آپ نے اپنی کتاب میں مروّج و مقبولِ عام اشعار بھی بہت ہی کم استعمال کیے ہیں۔ نہ شبلی سے مستعار لیے ہیں نہ مولانا ابوالکلام آزاد سے، بلکہ خود ہی اساتذۂ قدیم کی بیاضوں سے منتخب فرماتے ہیں۔ پھر جو شعر بھی آپ کی زبانِ قلم سے نکلا ہے بے اختیار نکلا ہے۔ مولانا آزاد کی طرح طویل تمہید کے بعد نہیں نکلا ہے — ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

پروفیسر سید خورشید حسین بخاری

گورنمنٹ گورونانک کالج۔ ننکانہ صاحب (ضلع شیخوپورہ)

برِصغیر پاک و ہند میں سوادِ اعظم نے حقانیت کا پرچم بلند کیا اور بحمداللہ تعالیٰ اب تک بلند رکھے ہوئے ہیں۔ اس طبقہ کے علماء نے دینِ مبین اسلام کے اصول و ضوابط کو عوام کے دلوں میں راسخ کرنے کی بے پایاں کوشش کی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی رہے۔ رزم یا بزم انہوں نے اپنے منتہائے نظر کو کبھی نہیں بھلایا اور ہر طرح سے سعی و کوشش کر کے عزم بالجزم کے ساتھ دینِ حق کی اشاعت کی چنانچہ آج اگر برِصغیر میں اسلام اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ موجود ہے تو بلاشبہ انہی بزرگانِ دین کا صدقہ ہے۔ ہمیں من حیث القوم ان حضرات کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

ان بزرگانِ دین نے مسلمانوں میں حُبِ وطن کُوٹ کُوٹ کر بھر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں بعض بدنہاد اشرار نے مسلمان حکومت ختم کرنے اور "کمپنی بہادر" کی حکومت قائم کرانے کے لیے برِصغیر میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی تو اس موقع پر ان حضرات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو علماء، درویش اور فقراء سر پر کفن باندھ کر میدان میں آئے۔ ان میں شہید حریت علّامہ فضلِ حق خیرآبادی

پیش پیش تھے۔ اللہ تعالیٰ کے اس شیر نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس وقت مسلم حکومت ختم ہو گئی اور برِ صغیر میں انگریز قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے تو انگریز مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کو ختم کر کے دم لیں گے اور ہندو ان کا ساتھ دل و جان سے دیں گے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ان کے یہ خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔

علم و فضل اور بصیرت کے لحاظ سے اس دور کا کوئی عالم علامہ فضلِ حق خیر آبادی کا ثانی نہ تھا۔ آپ کا مدرسہ اپنے زمانے کا بے مثل مدرسہ تھا، جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ تحصیلِ علم میں مصروف رہتے اور ان کے تمام اخراجات علامہ فضل حق خیر آبادی خود برداشت کرتے تھے۔

جب جنگِ آزادی شروع ہوئی تو حضرتِ موصوف نے اپنی فراستِ مومنانہ سے حالات کا جائزہ لے لیا تھا، چنانچہ آپ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد جاری کیا اور مقدمہ چلنے پر انگریز کی عدالت میں اس کا بڑی جرأت کے ساتھ اقرار بھی کیا، حالانکہ گواہوں نے عدالت میں آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا کہ شاید اس طرح آپ سزا سے بچ جائیں، لیکن آپ کی غیرتِ ایمانی نے گوارا نہ کیا کہ غلط بیانی کر کے قیدِ فرنگ سے رہائی حاصل کر لیں۔

ایک طرف تو اہلِ حق کی یہ کیفیت تھی کہ وہ ناموسِ ملک و ملت پر کٹ مرنے کے لیے تیار تھے اور اپنے راستے میں آنے والی کسی مشکل سے بھی خائف نہیں تھے، لیکن دوسری طرف اہلِ غرض تھے جو "قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند" کی درخشندہ مثال بن کر انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے، اور ان کے ایما پر مجاہدینِ جنگِ آزادی کی توجہ اپنے اصل مقصد سے ہٹانے میں مصروف تھے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مؤخر الذکر قسم کے لوگوں کے سیاہ کارناموں کا یا تو بیان نہ کیا جائے اور اگر تاریخی نقطۂ نظر سے ان کا بیان کرنا ضروری ہی تھا، تو تاریخی غیر جانب داری سے بیان کیا جاتا، تاکہ حقائق قارئین کے سامنے آ جاتے اور وہ جان لیتے کہ جنگِ آزادی میں کن لوگوں نے کیا کردار انجام دیا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ جن مردانِ حُر نے ۱۸۵۷ء میں انگریز حکومت کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی، انہیں تو وطن فروش تک کہا گیا، لیکن جنہوں نے انگریز کی صریحاً حمایت کی، ان پر داد و تحسین

ڈونگرے ہی نہیں برسائے گئے، بلکہ انہیں قومی ہیرو بنا کر پیش کیا گیا اور اس طرح تاریخی حقائق مسخ کیے گئے اور صحیح معنوں میں ملک، وملت کے لیے کام کرنے والوں کو گوشۂ گمنامی میں دھکیل دیا گیا ہمارے بعض مؤرخین نے ایسا کرنے سے عملاً غلط کردار انجام دیا ہے اور اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی ایسے لوگوں کو نابغۂ روزگار ہستی اور قومی ہیرو کے طور پر اپنی تحریروں کے ذریعے متعارف کرایا ہے، حالانکہ حقائق اس کے برعکس ہیں اور اگر حالات و واقعات کا تجزیہ کیا جائے اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کر کے معلومات بہم پہنچائی جائیں، تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان صاحبان نے اپنوں کے بجائے اغیار کا دم بھرا، قوم میں بد دلی اور مایوسی پیدا کی۔ انگریز کو برصغیر میں قدم جمانے میں مدد دی اور صوبہ سرحد میں بھی مسلمانوں کے خلاف ہی برسر پیکار رہے اور آخر اپنی فطرت کی وجہ سے اپنے فطرتی انجام کو پہنچے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ اہلِ علم اور خصوصاً محققین کو تحقیق صحیح کے ذریعے دکھایا جائے کہ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی کو ہیرو کہنے والے قدر "برخود غلط" ہیں اور وہ کس طرح عوام الناس کو ہی نہیں، بلکہ پڑھے لکھے طبقے کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں۔ الحمد للہ کہ راجا غلام محمد صاحب نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی کی دسیسہ کاریوں اور فتنہ پردازیوں کا پردہ چاک کر دیا۔ راجا صاحب نے حقائق مستند حوالوں اور دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی نے کس طرح انگریزوں کی امداد و اعانت کی۔ فاضل مؤلف کی تحریر میں جاذبیت ہے اور بیان میں حلاوت ہے۔ انہوں نے نفسِ مضمون کو جس انداز سے ترتیب دیا ہے اور اسے نبھایا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ جذباتیت سے معرّا اور دلائل سے آراستہ ان کی تحریر میں ایک دل آویزی پائی جاتی ہے اور یہی دل آویزی قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لیے جاتی ہے تاآنکہ قاری کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ تحریر کی یہ خوبی بہت بڑی ہے کہ کتاب ختم کر لینے کے بعد قاری ——— وہ عام قاری ہو یا محقق ——— مصنف کا ہم نوا ہو جاتا ہے اور اس کے سامنے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حضرت مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے

کردار کے ساتھ ساتھ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی کی اصل تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔ میں نے کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ کتاب پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ راجا صاحب کے دلائل اس قدر قوی اور مآخذ اس قدر مستند ہیں کہ ان سے انکار تو کجا، اختلاف کرنا بھی ناممکن ہے اور ایک اچھے مصنف اور محقق کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ تحقیق کے دوران متنازعہ مسائل میں اعتدال کا راستہ اختیار کرے، بلا استناد کوئی بات نہ کہے اور ٹھوس دلائل سے قاری کو اپنا ہم نوا بنالے۔

پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

سپیرئیر سائنس کالج۔ کراچی

اس کتاب کے مطالعے سے جن حقائق کا از سر نو علم ہوا، وہ میرے لیے انتہائی تعجب انگیز ثابت ہوئے۔ یقیناً ذرائع ابلاغ پر قبضے کے سبب جو تاریخی غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی اصلاح ضروری ہے۔ آپ کی کتاب میں "تاریخ تناولیاں" کے متعلق جو واقعہ صفحہ ۱۲۴ (اب صفحہ ۳۳) پر درج کیا گیا ہے۔ مجھے بھی کچھ اسی قسم کا تلخ تجربہ مرحوم مولانا غلام رسول مہر سے ملا اور علمی و ادبی کام کرنے والوں میں جس تنگ دلی کا مظاہرہ دیکھا گیا، اس سے مجھے ذاتی طور پر بے حد دکھ ہوا تھا اور یہ دکھ آج تک ہے۔ چونکہ میں خود اس تجربے سے گزر چکا ہوں، اس لیے تاریخ تناولیاں" کے سلسلے میں ان کا ردِ عمل یقیناً ایسا ہی ہوگا، جس کا ذکر آپ کی کتاب میں آیا ہے۔ جب صاحبانِ علم اس طرح لوگوں کو طرح دے دیں، تو پھر کس کی شکایت کی جاسکتی ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی ہے اور اس جنگِ زرگری سے جو نقصان مسلمانوں اور جو فوائد برٹش گورنمنٹ کو پہنچے، اس کی تفصیل دردناک بھی ہے۔ اسلام کی سب سے

بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ ایک فرقہ اپنے نظریات پیش نہیں کرتا، بلکہ دوسرے پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے۔ معلوم نہیں کہ خود اس کے دین کے ساتھ اس کے اعمال کی ضمانت اس کو اس زندگی میں کہیں براہِ راست تو نہیں مل گئی ہے۔

ایک گزارش آپ سے یہ ہے کہ بعض جگہ زبان کو اور متین بنانے کی ضرورت ہے۔ کہیں کہیں لہجے میں درشتی اور کرختگی بھی ہے ۔ یہ مناظرے کی کتاب نہیں، بلکہ تاریخ کی اہم کتاب ہے اور تاریخ کی کتاب میں طنز و طعن میں کمی کی ضرورت ہے۔ بہر حال میں آپ کے اس تحفے کے لیے از حد شکر گزار ہوں۔

پروفیسر حافظ سید مقصود علی

گورنمنٹ ممتاز کالج، خیر پور میرس (سندھ)

زندہ قومیں اپنے اسلاف کے کارناموں کو فراموش نہیں کرتیں۔ وہ ان کے شاندار ماضی کو مشعلِ راہ بنا کر اپنے حال کی راہ گزر کو روشن رکھتی ہیں۔ ان کے یہ کارنامے نئی نسل کو عزم و استقلال اور جرأت و ہمت کا سبق دے کر ان کے قول و عمل میں خلوص، ارادوں میں استقامت، کردار میں بلندی اور نقطۂ نظر میں آفاقیت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے پیغام کی ہمہ گیری سے ظلمتوں کے پردے چاک ہوتے ہیں اور نئی نسل کو حیاتِ نو حاصل ہوتی ہے ؎

جو ہو سکے تو کرو چاک دامنِ ظلمت
ستارہ بن کے چمکنے سے کچھ نہیں ہوتا

یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ہمارے بعض مؤرخین نے سوادِ اعظم کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور جد و جہدِ آزادی میں ان کی گراں قدر خدمات کو یکسر نظر انداز کر کے ایک غیر محققانہ اور جانبدارانہ نقطۂ نظر پیش

کر کے تاریخی حقائق کو مسخ اور ملی روایات کو مجروح کیا ہے۔ یہ احسان فراموشی اور تاریخی بددیانتی کی المناک داستان ہے۔ فاضل مرتب نے نہایت کامیابی کے ساتھ ان باطل نظریات، خود ساختہ تصورات کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت سے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ ان کی یہ کوشش لائقِ تحسین اور قابلِ قدر ہے۔

راجا صاحب کی تحریر میں سادگی کے ساتھ جاذبیت کا حُسن بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ موصوف نے علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار سے قاری کو متعارف کراتے ہوئے اعتدال اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ کسی مقام پر بھی معقولیت پسندی پر عقیدت غالب ہوتی نظر نہیں آتی۔ طرزِ استدلال فلسفیانہ، جذبہ عاشقانہ اور نقطۂ نظر محققانہ ہے۔ لہجے کی بے ساختگی، خلوص کی فراوانی، بیان کا تسلسل، واقعات کی صداقت، تلاشِ حق کی جستجو، موضوع اور موقع کی مناسبت سے اشعار کے برمحل استعمال نے کتاب کے معنوی حُسن اور افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ موصوف نے محققین، اہلِ علم اور دانشوروں کے مستند حوالے اور ان کی تحریروں سے اقتباسات پیش کر کے دلائل کے وہ انبار لگا دیئے ہیں کہ قاری کے لیے اعترافِ حق سے گریز ناممکن ہے۔ نئی نسل جو اپنے ماضی کو صرف "قصۂ ماضی" ہی سمجھتی ہے، اس کے اندر محبت اور عقیدت کے جذبات بیدار کر کے اپنے اسلاف کے نقوش پا کو نشانِ منزل بنانے کی بے پناہ تڑپ پیدا کر دی ہے اور انہیں یہ یقین دلایا ہے ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی۔

مختصر یہ کہ "امتیازِ حق" کے مطالعے سے جہل کی ساری کثافت دُھل جاتی ہے۔ حق پرستی کا چہرہ بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور ذہن میں علم و آگہی کے قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ علامہ فضلِ حق خیرآبادی کی مجاہدانہ زندگی کے بے شمار گوشے بے نقاب ہوتے ہیں اور یہ مردِ حق پرست ہمارے سامنے حق کی خاطر زمانے بھر سے بھڑ جانے والا مجاہد عارفانہ اور مومنانہ نقطۂ نظر

رکھنے والا مسلمان استقامت کا پہاڑ، حق پرستی کا بے مثال آئینہ، ایثار و قربانی کا مجسمہ اور علم و عمل کی صداقت کا ایک بحرِ بے کراں نظر آتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ راجا صاحب نے اس مردِ حق کی ذات مجموعۂ صفات سے ہمیں روشناس کرانے کا حق ادا کر دیا ہے۔

سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی

علامہ فضل حق خیر آبادی کو علوم و فنون میں جو اجتہادی مقام حاصل تھا، وہ اظہر من الشمس ہے۔ مخالفین کو بھی علامہ کی علمی عظمت اور فنون پر دستگاہ کا پورا اعتراف ہے۔

علامہ کی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرا۔ اس کو زندگی کا دورِ اول کہنا مناسب ہے۔ اس دور میں آپ نے حاشیہ قاضی جیسی نادرۂ روزگار کتاب لکھی جس کو معقولات کا فتاویٰ کہا جاتا ہے۔ مبحث وحدۃ الوجود میں "الروض المجود" تصنیف فرمائی، جس میں عقلی دلائل سے اس مسئلہ کو ثابت فرمایا ہے۔ "تہذیب الکلام" کی شرح لکھی جو اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن علامہ عبدالحق خیر آبادی کی وفات کے بعد اس کا نسخہ ضائع ہو گیا۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا نور الحسن کاندھلوی، مولانا ہدایت اللہ خاں جونپوری، مولانا عبدالحق خیر آبادی جیسے فخرِ روزگار تلامذہ پیدا کیے جنہوں نے اپنی تدریسی اور علمی شہرت سے ہندوستان کی مختلف درس گاہوں کے فضلا کو اپنے حلقۂ تلمذ میں داخل کر لیا۔

اس دور میں علامہ نے قلمی جہاد بھی کیا۔ مسئلۂ امکانِ کذب اور امکانِ نظیر کے بطلان پر قلم اٹھایا اور دلائلِ قاہرہ سے ان کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔

چونکہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین اور شفیع المذنبین ہے، جس پر سلف سے خلف تک تمام اہلِ سنت کا اتفاق ہے اور ان کے نزدیک

آپ کی تعظیم و تکریم عین ایمان ہے۔ بالفاظِ دیگر "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" پر اکابر امت کا اجماع و ایقان ہے۔ مسئلہ امکانِ نظیر سے اس لازوال عقیدہ پر ضرب پڑتی تھی اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت معاذاللہ مجروح ہوتی تھی، اس لیے جذبۂ عشقِ نبوی نے علامہ کو بے قرار کر دیا۔ علامہ حبِ نبوی میں ایسے سرشار تھے کہ تمام زندگی اپنے قصائد میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدح سرائی کرتے رہے۔ وہ اپنی دنیوی اور اُخروی تمناؤں اور امیدوں کا مرکز ذاتِ رسالت کو سمجھتے تھے، ایسے عقیدہ کو کیسے برداشت فرماتے جس سے شانِ رسالت پر حرف آتا تھا۔

حال ہی میں مکتبہ قادریہ لاہور نے ایک کتاب "امتیازِ حق" شائع کی ہے جس کو علامہ فضل حق کی جدوجہد آزادی کی محققانہ تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ مصنف نے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے سلسلہ میں اس موضوع پر جتنے تاریخی مآخذ و مصادر تھے سبھی سے استفادہ کیا ہے۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں رسالوں اور دستاویزوں کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ کتاب مدون کی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت نے جدوجہد آزادی کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا ہے اور اس کے وجود پذیر ہونے سے بہت سے حقائق جن پر پردہ پڑا ہوا تھا سامنے آ گئے۔ مصنفِ کتاب کی محنت اور عرق ریزی سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا۔ اربابِ علم اور اصحابِ تحقیق کی جانب سے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ اہلِ دانش سنجیدگی سے اس تحقیق پر غور کریں گے، لیکن ابھی ایک بحث تشنۂ تحقیق ہے وہ یہ کہ علامہ نے جہاد کا جو فتویٰ تحریر فرمایا تھا اور جس پر دوسرے علماء سے دستخط حاصل کیے تھے اور جو اس تمام ہنگامہ کی بنیاد تھا، وہ کہاں ہے؟ جن مآخذ کا حوالہ فتویٰ کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اس میں صرف فتویٰ کا مفہوم درج ہے لیکن خود فتوی کی کیا عبارت تھی اور کن دلائل سے اسے مزین کیا گیا تھا، اس کا کوئی نشان نہیں ملتا، اگر اصل فتویٰ نہ مل سکے، تو اس کی مستند نقل ہی سے حاجت برآری ہو سکتی ہے۔ اگر وہ فتویٰ سامنے آ جائے، تو مخالفین کے قلعے خود بخود مسمار ہو جائیں گے۔ امید ہے کہ مصنفِ کتاب اس مسئلہ کی تحقیق میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف فرما دیں گے۔

حکیم مسعود احمد برکاتی

ہمدرد اکیڈمی، ناظم آباد کراچی ۱۸

راجا غلام محمد صاحب کی کتاب "امتیازِ حق" اگرچہ مختصر ہے، لیکن اس میں انہوں نے جو مواد جمع کیا ہے، وہ تفصیلی کتابوں پر بھاری ہے۔ راجا صاحب نے مجاہدِ حریت، جامع کمالات حضرت علامہ فضلِ حق خیر آبادی کے تبحرِ علمی اور سرفروشی و جاں سپاری پر جن لوگوں نے ناروا حملے کیے ہیں یا اُن کو اپنے معاصرین سے گرا نا چاہا ہے، ان کی تردید و تغلیط کی ہے۔ اندازِ بیان اگرچہ پُر جوش ہے، لیکن ان کی باتوں کی پشت پر اہلِ علم اور مؤرخین و محققین کے حوالوں کی گواہی بھی ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ علماء و اہلِ قلم کی تحریروں سے آراستہ ہے۔ راجا صاحب نے جو بات کہی ہے، وہ انہی کی زبان و قلم سے کہی ہے۔

"امتیازِ حق" کا ایک امتیاز اس کی دلچسپی بھی ہے۔ کتاب کے نام اور موضوع کے لحاظ سے خیال ہوتا ہے کہ خشک تحقیقی کتابوں کی طرح اس کتاب کا مطالعہ بھی فرض اور ناگزیر ضرورت سمجھ کر ہی کیا جا سکے گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کا شگفتہ اندازِ قاری کو اپنے ساتھ خود لے جاتا ہے۔

علامہ فضلِ حق خیر آبادی ان مظلوم محسنینِ ملت میں سے ہیں جن کی بدولت آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، لیکن جن کی عظمت کو پہچاننے سے ہم محروم ہیں، بلکہ بعض "تاریخ سازوں" نے تو اس بانیٔ جدوجہدِ آزادی کے روشن کردار کو مسخ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اگرچہ ان کی یہ احسان فراموشی تاریخ کے رُخِ زیبا کی چمک کو کم نہ کر سکے گی۔ ضرورت ہے کہ جدوجہدِ آزادی کے اس تابناک اور اہم ترین باب کو جس کا عنوان "فضلِ حق خیر آبادی" ہے پوری تفصیل، جامعیت، استناد، تحقیق اور ذمہ داری کے ساتھ مدوّن کیا جائے۔ راجا غلام محمد صاحب جیسے پُر خلوص اہلِ قلم یہ کام کر سکتے ہیں۔

پروفیسر عبدالرشید فاروقی

گورنمنٹ کالج ساہیوال

تصنیف و تالیف کے میدان میں چند افراد نے اسلافِ اہلِ سُنّت کے ساتھ ہمیشہ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا۔ فرضی داستانوں پر مشتمل نام نہاد تاریخی واقعات کے ایسے محلات تعمیر کیے گئے جنہوں نے نوجوان نسل کی آنکھیں چندھیا دیں۔ حقائق کی پردہ پوشی کا یہ عجیب و غریب ڈرامہ کافی عرصہ تک کھیلا جاتا رہا۔ ساتھ ہی مجھے زیرِ لب یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ احباب اہلِ سنّت نے بھی اس معاملے میں کافی بے اعتنائی برتی اور ضرورت سے زیادہ بے فکری کا ثبوت دیا۔ قلم کی ان بے رحمیوں کا شکار ہونے والی شخصیات میں سے ایک علامہ فضلِ حق خیر آبادی بھی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے یقیناً عرق ریزی سے حقائق کو بے نقاب کیا ہے۔ علامہ فضلِ حق خیر آبادی کی دینی و ملی خدمات پر پردہ پوشی اور ان کی سیاسی خدمات کو نظروں سے اوجھل کر دینے کی تمام کوششوں کا محرک در اصل خود علامہ فضلِ حق کا وہ نعرۂ رندانہ تھا جو انہوں نے مصلحت بینی کے تمام تقاضے بالائے طاق رکھتے ہوئے لگایا جو اسمٰعیل دہلوی سمیت ان تمام افراد کے خلاف تھا جو بعض انگریزوں کی خوشنودی اور اپنے سرکاری وظائف میں بتدریج اضافے کے پیشِ نظر قرآن و سنّت کے واضح احکام کو مسخ کرنے کا مذموم پیشہ اپنائے ہوئے تھے۔

اس جُرم کی ملی ہے سزا تیرے شہر میں
کیوں شب کو شب ہی کہتا رہا تیرے شہر میں

فاضل مصنف نے متعدد حوالوں کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ کے مصداق علامہ فضلِ حق کا فتویٰ جہاد انگریزی عدالتوں میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات

کا دلیرانہ اعتراف، نہ صرف دہلی بلکہ لکھنؤ میں بھی مسلمانوں کی قیادت و راہنمائی کارہائے نمایاں کی حیثیت سے علامہ فضل حق کی زندگی کے روشن ابواب ہیں، جن کا اعتراف ان کے مخالفین نے بھی کیا ہے اور جن کے ذکر کے بغیر تاریخ کی ہر کتاب ادھوری معلوم ہوتی ہے۔

جناب راجا غلام محمد صاحب نے علامہ کی سیاسی، ملی اور دینی استقامت کا جو ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، اس کے بعد یقیناً ہر قاری علامہ فضل حق کی سوانح حیات کے متعلق بھی مزید کچھ جاننا چاہتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ کتاب کے چند اوراق اس کے لیے بھی مخصوص کر دیتے جاتے[1]

تقابلی جائزے میں مصنف نے سینکڑوں حوالہ جات، ٹھوس واقعات اور ناقابل تردید حقائق کی روشنی میں اسمٰعیل دہلوی کی جو تصویر کشی کی ہے، اس سے حقیقتِ حال قارئین کرام کے سامنے آجاتی ہے ان حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ دینِ اسلام کے فروغ کی آڑ لے کر جہاد کا جو فرضی ڈرامہ اسمٰعیل دہلوی اور اُن کے رفقاء نے کھیلا، اس سے جو سیاسی مقاصد حاصل کیے۔ پھر اس عیاری کو دینداری اور شرافت کا لبادہ پہنا کر جس وسیع تر منصوبہ بندی کے تحت فروغ دیا گیا، وہ امتِ مسلمہ کے ساتھ بڑا ہی عجیب مذاق ہے۔ حیرت ان لوگوں پر ہے جو فریب اور دغابازی کے اس پلندے کو بلاتحقیق گرنتھ اور رامائن سمجھ کر پڑھتے رہے۔ مکرمی راجا غلام محمد صاحب لائقِ صد تحسین ہیں کہ انہوں نے زیرِ تبصرہ کتاب لکھ کر ایک دینی و ملی فریضہ ادا کیا ہے اور احبابِ اہلِ سنت کو دعوتِ فکر دی ہے کہ وہ اس طرح کی دیگر سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

کتاب کے آخری حصے میں مصنف نے سرحد میں اسمٰعیل دہلوی کی جو کارگزاری اور ان کی جو اخلاقی حالت بیان کی ہے، اس کے بعد ہم ان نام نہاد دینداروں کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں ؏

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

---

[1] علامہ کے سوانحی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "باغی ہندوستان" ملنے کا پتا، مکتبہ قادریہ، لوہاری منڈی، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محب الحق اعظمی

مُسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ (بھارت)

امتیازِ حق کے مطالعہ سے ہر عام قاری کے ذہن میں بھی یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ محض اختلافِ مسلک کی بنیاد پر علامہ فضلِ حق خیرآبادی کے عظیم کارناموں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا اور سید احمد رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل دہلوی کے ۱۹۴۷ء سے قبل تک انگریز دوست ہونے پر فخر کیا گیا اور پھر اس کے بعد انگریز دشمن ثابت کرنے کیلئے مسلسل جھوٹ بولا گیا۔

لیکن جو نئی کتابیں ادھر چند برسوں میں طبع ہوئی ہیں۔ انہوں نے نام نہاد مؤرخین کی ساری قلعی کھول کر رکھ دی ہے اور اب حقائق کا صحیح رُخ عوام و خواص کے سامنے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کتابوں میں امتیازِ حق کو نمایاں مقام حاصل ہے اور راجا غلام محمد صاحب واقعی طور پر ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

پروفیسر مُنیر قصوری

گورنمنٹ کالج ۔ باغبان پورہ ۔ لاہور

میری نظر میں "امتیازِ حق" نہ صرف پُرمغز اور جامع کتاب ہے، بلکہ یہ دورِ جدید کے تمام تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ قاری اسے پڑھتے وقت کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ ایک خالص مذہبی یا خالص تاریخی نوعیت

کی کتاب ہے۔ اس کتاب کا اسلوب نہایت شستہ اور نکھرا ہوا ہے۔ اس کی عبارتوں میں تسلسل اور جاذبیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں امامِ اہلِ سنّت علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور عامۃ النّاس کو ہر دو شخصیتوں کے بارے میں صحیح اور ٹھوس معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر اس سے زیادہ اچھی کتاب آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ میرے خیال میں یہ ایک خوبصورت دستاویز ہے۔

"امتیازِ حق" کے مؤلف راجا غلام محمد نے یہ کتاب منظرِ عام پر لا کر نہ صرف مِلّی خدمات کا فریضہ انجام دیا ہے، بلکہ بہت اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں ان کی اس ہمت کی داد دیتا ہوں۔ ان کا یہ کارنامہ اہلِ سنّت، کے قلمی جہاد کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ ان کے اس عمل سے نہ صرف ہمیں ہمارے اسلاف کی زرّیں تاریخ کے گم شدہ اوراق کا پتا چلا ہے، بلکہ کفر و الحاد اور نام نہاد مسلمانوں کی فتنہ پردازیوں کے خلاف کمربستہ اور صف آرا رہنے کا درس ملا ہے۔ "امتیازِ حق" حق و باطل کے درمیان خطِ امتیاز کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر فیاض کاوش

ملک و ملّت کی حریت و آزادی کے بطلِ جلیل حضرتِ علامہ فضلِ حق خیرآبادی علم و ادب اور مذہب و سیاست کے مہرِ نیم روز وہ خود اپنی ذات میں ایک انجمن ہونے کی حیثیت سے اپنے پورے عہد پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ علم و ادب کا ایک ایسا ادارہ تھے جس کا فیضِ عرفان و آگہی بعدِ مرگ بھی جاری و ساری رہا۔ اسی کے فانوسِ علم سے سر سیّد اپنی تحریکِ اصلاحِ ادب کا چراغ جلاتے ہیں اور اسی کے نقد و

نظر کے منارۂ نور سے رہنمائی حاصل کر کے غالب، غالب نظر آتے ہیں۔ ادبائے عہد اس کے خوشہ چین ہیں اور علمائے وقت اس کے حاشیہ نشین۔ مومن خاں مومن اپنے تو ہب کے باوجود اس کے ہجر میں آنسو بہاتے ہیں ع منہ ڈھانپ ڈھانپ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

بادشاہ بہادر شاہ ظفر اس کی پیشوائی پر فخر فرماتے تھے اور علمائے ہندوستان اس کے در کی گدائی پر اتراتے تھے۔ اسی ذات والا صفات کا ذکرِ خیر اس صحیفۂ محبت میں ہے۔ مزید یہ کہ اب تک موصوف کے حق میں جو ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں، اس کتاب میں ان سب کا تجزیہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا گیا ہے۔

تاریخ کا یہ بہت دل گداز پہلو ہے کہ حریت کے اس جانباز سپاہی نے اپنے خون کی سرخی سے ملکی آزادی کے محضر نامے پر دستخط کیے تھے۔ ابھی اس کی روشنائی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس محسن ملک و ملت کے کارہائے نمایاں کو فراموش کیا جانے لگا۔ اس کی علمی کاوشوں پر پردے ڈالے گئے۔ اس کے عملی کارناموں پر خاک اڑائی گئی۔ دشمنانِ ملک و ملت کو اس کے مقابلے میں ہیرو بنا کر پیش کیا گیا اور یہ جھوٹ اس قدر تواتر سے بولا گیا کہ جھوٹ ہی سچ نظر آنے لگا۔ اس طرح تاریخ کے دھارے کو اس کے خلاف موڑ دیا گیا محض اختلافِ عقائد کے سبب! ۔ کیونکہ وہ عاشقِ رسول، دشمن شاتمانِ رسول تھا۔ بہر حال بھلا ہو فاضل مؤلف راجا غلام محمد صاحب کا جنہوں نے صدیوں کا قرض اتار دیا اور بد دیانت مؤرخوں کو ملت کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔

فاضل مؤلف میدانِ تنقید کے شہسوار اور بحرِ تحقیق کے شناور معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے جانفزا وار کرتے ہیں کہ دشمن بھی زخم کھا کر مسکرائے، اندازِ نگارش ایسا دلنشین ہے کہ زہر بھی تریاق بن جاتے۔ اشعار ایسے ترنم خیز کہ روح وجد میں آجائے۔ ایک ایک فقرہ ایسا دل افروز کہ بڑی بڑی ضخیم کتب پر بھاری! الاریب! ہر ہر لفظ پر دل جھوم جاتا ہے لکھنے والے کا قلم چومنے کو جی چاہتا ہے۔ زبان کی شیرینی اور بیان کی دلنشینی اپنا جواب خود آپ! ۔ اشعار ایسے لاجواب کہ لاکھوں میں انتخاب! ۔ ان کا استعمال ایسا برمحل کہ گویا وہ موزوں ہی اسی موقع کے لیے ہوئے تھے۔

اگر ہمارے تمام متنازع مسائل کو ایسا دلکش اندازِ بیان مل جائے تو یقیناً ہمارے اکابر کے کارناموں پر صدیوں کی غلط بیانی کا چڑھا ہوا غبار چھٹ جائے اور ان کی شخصیت کا سورج پوری آب و تاب سے چمکتا ہوا نظر آئے۔

محمد عبدالشاہد شروانی

"امتیازِ حق" راجا صاحب کے تتبع و تلاش کا شاہکار ہے۔"تاریخِ تناولیاں" نے یہ مسئلہ پہلے ہی صاف کر دیا تھا۔"امتیازِ حق" نے یہ پہلو بھی صاف کر دیا کہ وہ انگریزوں کے مخالف نہیں بلکہ موافق و حامی تھے۔ہٹلر کے دستِ راست گوئبلز کا قول تھا کہ جھوٹ اتنی بار بولو کہ سچ معلوم ہو

جناب نادم عصری

ماہنامہ "مہر و ماہ" لاہور

زیرِ نظر کتاب "امتیازِ حق" چودہ ابواب پر مشتمل ہے جس میں پیکرِ حریت سن ستاون کی جنگِ آزادی کے عظیم مجاہد "مولانا فضلِ حق خیر آبادی" مرحوم و مغفور کے قابلِ تقلید کارہائے نمایاں حقائق کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا کی سیرت و کردار کے بارے میں خونِ جگر سے تحریر کردہ مبنی بر حقائق ہر بصیرت افروز فقرہ بڑی بڑی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے۔کتاب کا مختصر پیش لفظ مولانا مفتی محمد عبدالقیوم قادری ہزاروی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جسے ایک مستند تاریخی دستاویز کہا جائے، تو بیجا نہیں ہوگا۔ فاضل مؤلف نے مذکورہ کتاب میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ نہایت احسن طریقے سے پیش کیا ہے اور اس ضمن میں دینی مسائل کو موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ جو لوگ مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے دینی اور سیاسی اختلاف رکھتے تھے، مؤلف نے بڑی عرق ریزی سے ان مخالفین کی

لہ ملنے کا پتا: مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ، لوہاری منڈی، لاہور

کتابوں کے اقتباسات "امتیازِ حق" کے صفحوں پر پھیلا دیئے، جن کو باشعور قاری کے علاوہ دورِ جدید کا کوئی بڑے سے بڑا مورخ بھی جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

سن ستاون کی جنگِ آزادی کے ہیرو جنرل بخت خاں سے مل کر مولانا نے سفید فام قوم کے سیاہ دل انگریز باشندوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کالے پانی کی سزا کے مستحق قرار پائے اور جزیرہ انڈیمان میں اس پیکرِ حریت جید عالمِ دین نے نہایت کسمپرسی کی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔ زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ آج بھی مخالفین کا ایک طبقہ جنگِ آزادی کے اس مجاہد کو اچھے القاب سے مخاطب نہیں کرتا اور ان لوگوں کی شان میں تعریفوں کا پُل باندھ رہا ہے، جن کا مولانا خیر آبادی کی ذات سے موازنہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس شرمناک کیفیت کو حریت پسند حق پرست انسان مولانا کی روح کے لیئے تکلیف کا باعث سمجھتے ہیں اور یقیناً پس مرگ اس عظیم مجاہد کے ہونٹوں پر یہ الفاظ تھرکتے ہوں گے ؎

نیرنگئ سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

چودھویں اور آخری باب میں فاضل مؤلف نے ٹھوس دلائل اور تاریخی کتب کے حوالہ جات سے مولانا فضل حق اور اسماعیل دہلوی و سید احمد بریلوی کے کردار کا تقابلی جائزہ پیش کرنے کے بعد ان الفاظ پر اپنی کتاب "امتیازِ حق" کا اختتام کیا ہے۔

"ان واقعات کی روشنی میں قارئین کرام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ برصغیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں کس نے کیا کارنامہ انجام دیا؟ آزادی کی لگن کس کے دل و دماغ میں بسی تھی؟ اور کس کا جوہر ادراک انگریز حکام نے خرید رکھا تھا۔"

برصغیر کے مسلم مجاہدین کے بارے میں لکھی گئی ۳۳۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مستند تاریخی کتابوں میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور یہ ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دینے پر "امتیازِ حق" کے فاضل مؤلف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ماہنامہ "مہر و ماہ" لاہور۔ اپریل ۱۹۷۹ء)

جنابِ نسیم بستوی

مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ "فیض الرسول" براؤں شریف (بھارت)

"امتیازِ حق" علامہ فضل حق خیر آبادی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا ایک تقابلی جائزہ ہے جس میں فاضل مرتب جناب راجا غلام محمد صاحب نے حسب ذیل عنوانات کے تحت جنگِ آزادی کے بعض اہم تاریخی وسیاسی حقائق کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ..... کتاب کے پہلے مضمون میں ذاتی خیال ونظریہ کا جس بیباکانہ انداز میں اظہار کیا گیا ہے، وہ حق پرستی وحقیقت پسندی کا ایک فکر انگیز اور واضح نمونہ ہے۔

فاضل مرتب نے "امتیازِ حق" میں ہندوستان کے جس دور کا تذکرہ کیا ہے، وہ نازک اور پُرآشوب دور تھا، جب دنیا دار علماء ضمیر فروشی اور زبان وقلم کی سوداگری میں سب سے آگے آگے نظر آتے تھے اور اسی طبقہ کو آلۂ کار بنا کر برسرِ اقتدار حکومت نے مسلمانوں پر ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑے، ان کو نہایت بے دردی سے تہ تیغ کیا گیا۔

کتاب "امتیازِ حق" پڑھنے سے ان مجاہدینِ حریت اور شہیدانِ وفا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو زندگی کی آخری گھڑیوں تک ولولہ انگیز نعرہ بلند کرتے رہے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

(ماہنامہ فیض الرسول۔ اپریل ۱۹۸۱ء)

پروفیسر محمد عظیم بھٹی

گورنمنٹ جناح اسلامیہ کالج، سیالکوٹ

ہماری ملی تاریخ کے بہت سے ایسے گوشوں ہیں؛ جن پر مؤرخین کا قلم اُن کے ذاتی عقائد اور گروہی تعصبات کی وجہ سے ہمیشہ خاموش تماشائی بنا رہا ہے۔ ایک گوشہ فضل حق خیرآبادی کے سیرت و کردار، اعمال و افکار اور دینی و سیاسی خدمات کا ہے۔ جس پر اظہار خیال کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ کوتاہی برتی گئی ہے اور خواہ مخواہ ایسے لوگوں کو اس مسند پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے، جس کے وہ ہرگز اہل نہیں تھے۔ اس گروہ میں اسمٰعیل دہلوی اور ان کے دوسرے ساتھی شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "امتیازِ حق" میں (جو اسم بامسمّٰی ہے) پہلی بار علمی دلائل اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ہمارے مؤرخین کی اس اہم کوتاہی پر قلم اٹھانے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے ان گوشوں کی بطریقِ احسن نقاب کشائی کی گئی ہے، جس سے علامہ فضلِ حق خیرآبادی کے سیرت و کردار پر بالعموم اور ان کی سیاسی خدمات پر بالخصوص روشنی پڑتی ہے۔ کتاب ایک دینی، علمی اور تاریخی ضرورت کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی ایک عمدہ مرقع ہے جس کے لیے اس کے مؤلف راجا غلام محمد بلاشبہ خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔

حکیم محمود احمد برکاتی

برکات اکیڈمی - ۲۹۸ - اے - بلاک ۴ - لیاقت آباد - کراچی

یہ کتاب اپنی شائستگی اور سلاست بیان کے لحاظ سے ایک منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ اس انداز سے کتابیں لکھی جائیں تو ارباب نظر کو متاثر کر سکتی ہیں۔

پروفیسر ولی محمد

گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج، سرگودھا

"امتیازِ حق" کے فاضل مؤلف نے بطلِ حریت علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور اسماعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اسمٰعیل دہلوی اور اس کے پیر سید احمد بریلوی کے فرضی جہاد کا بھی تاریخی حقائق کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔

میں نے اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھا۔ فاضل مؤلف نے مستند تاریخی حوالہ جات پیش کیے ہیں اور ابوالحسن علی ندوی، مسعود عالم ندوی، غلام رسول مہر اور پروفیسر ایوب قادری کے تلبیسِ حق کے پروگرام کو بے نقاب کر دیا ہے۔

اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی کی انگریز دوستی اور فرضی جہاد پر تبصرہ کرتے وقت ایک مؤرخ کی حیثیت سے فاضل مؤلف نے ان کی ذاتی تحریروں، ان کے ہم عقیدہ علماء اور ہم عصر لوگوں کی تحریریں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ میرے نزدیک ہر اس شخص کو اس کتاب کا مطالعہ ضروری کرنا چاہیے جو تاریخی حقائق کو جاننا چاہتا ہے۔

میاں عبدالرشید

کالم نگار "نورِ بصیرت" روزنامہ "نوائے وقت" لاہور

شاہ اسمٰعیل دہلوی معروف شخصیت ہیں، مگر مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے، حالانکہ آپ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو تھے۔

انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ آپ کے ایما پر تیار ہوا اور اس پر آپ کے دستخط تھے۔ کردار اتنا بلند تھا کہ اس "جرم" کی پاداش میں جب مقدمہ چلا تو گواہ اسے ثابت نہ کر سکے، مگر مولانا نے خود اس کا اعتراف کر لیا اور اسی حق گوئی کی بنا پر انڈیمان بھیجے گئے، اور وہاں وفات پائی۔ قابلیت کے لحاظ سے ان کے مقام کا اندازہ اسی ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ غالب جیسا نابغۂ روزگار جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، آپ کا قدر دان تھا اور اشعار میں آپ کی اصلاح اور مشورے قبول کرتا تھا۔

زیرِ نظر کتاب نہایت تحقیق سے مستند حوالوں کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ اسلوبِ تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔ جابجا موزوں اشعار نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ بات نپے تلے الفاظ اور پُرزور انداز میں کہی گئی ہے۔

(روزنامہ "نوائے وقت" لاہور۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۹ء)

حافظ مظہر الدین مرحوم

راولپنڈی

"امتیازِ حق" ایک عزیز کے توسّل سے ملی جس نے مجھے غایت درجہ متاثر کیا ہے۔ قلمی و مالی جہاد کے عوض بھی اگر جنت مل سکتی ہے، تو آپ زنا شر اور مصنف محروم نہیں رہیں گے۔ مصنف کو میرا اسلام نیاز پہنچا دیجئے

محمد عاصم اعظمی

ایم۔اے (بھارت)

زیرِ نظر کتاب "امتیازِ حق" پاکستان کے مشہور قلم کار راجا غلام محمد صاحب کی محققانہ تصنیف ہے، جس میں آپ نے تاریخی خیانتوں، ناانصافیوں اور حق و صداقت کے برملا قبل عام کی روش پر کاری ضرب لگائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسمٰعیل دہلوی اور مجاہدِ آزادی حضرت علامہ فضلِ حق خیرآبادی کو تاریخ کی میزانِ عدل پر رکھ کر یہ اندازہ کریں کہ وطن دشمن کون تھا اور وطن کا سچا شیدائی کون تھا؟ بالاکوٹ کے محاذ پر انگریز آقاؤں کے ایماء و اشارے پر اہلِ وطن کو ذبح کرنے والے کون تھے؟ اور ۱۸۵۷ء میں انگریزی سامراجیت کے خلاف مجاہدوں کی صفیں درست کرنے والا کون تھا؟

راجا صاحب کی تاریخی حقائق پر مبنی یہ کتاب الیساصاف وشفاف آئینہ ہے جس میں حقیقی مجاہدینِ آزادی اور نام نہاد حریت پسندوں کے چہرے کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

راجا صاحب نے اپنی کتاب میں ایک باب "انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد" قائم کیا ہے اور حقائق و معارف کی روشنی میں افترا پردازوں کی خوب قلعی کھولی ہے۔ تلاش وجستجو کے نتیجے میں انھوں نے معتبر اہلِ قلم کے ایسے اقتباسات حوالوں کے ساتھ جمع کردیئے ہیں، جن سے محمد ایوب قادری ہی کا لک رام اور دوسرے اربابِ قلم کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مشہور ناقد و مؤرخ مولانا عبد السلام ندوی کی کتاب "حکمائے اسلام" جلد دوم کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں جس میں مولانا ندوی نے حضرت علامہ کی شجاعت و جوانمردی اور فتوائے جہاد کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے:

"ان تمام مناصب جلیلہ کے بعد مولانا کی دینی آزمائش کا وقت آیا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا بھی باغی قرار دیئے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتوائے جہاد کی پاداش یا

جُرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا تو رہائی کے بہت سے اسباب اگرچہ پیدا ہو گئے تھے، لیکن مولانا نے خود فتویٰ کی تصدیق نہایت جراَتِ ایمانی سے کر دی، اس لیے عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور وہ جزیرۂ انڈیمان روانہ کر دیئے گئے۔"

(حکمائے اسلام جلد دوم، صفحہ ۳۳۲، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ)

"راجا صاحب کی حقیقت افروز کتاب نے اہلِ دیوبند کے اس شیش محل کو پاش پاش کر دیا ہے جس میں بیٹھ کر وہ اپنے اکابر کے انگریز حامی سیاسی کرداروں کو چھپاتے ہیں اور اہلِ حق مجاہدینِ آزادی کے روشن و تابندہ کرداروں کی اہمیت و حیثیت کو ختم کرنے یا اسے گھٹانے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔"

(ماہنامہ فیضِ الرسول، براؤں شریف، بھارت - نومبر ۱۹۸۱ء)

پروفیسر محمد حسین آسی

گورنمنٹ جناح اسلامیہ کالج - سیالکوٹ

جب برِ صغیر کی سرزمین میں مَن کے کالے تن کے گورے افرنگیوں کا ورودِ نامسعود ہوا شاطرِ افرنگ نے اپنے ناپاک مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ملّتِ اسلامیہ کا باہمی انتشار ضروری سمجھا۔ کھلم کھلا دشمنِ اسلام ہونے کی حیثیت سے اُس کے لیے ایسا کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ پس منظر میں رہ کر کسی بکاؤ مال کی تلاش میں تھا۔ ستم ظریفیٔ حالات دیکھئے کہ قرعۂ فال اسمٰعیل دہلوی کے نام پڑا۔ یہ وہی اسمٰعیل صاحب ہیں جو حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے اور فخر المحدثین شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے تھے۔ یہ ایسے "بندۂ تسلیم و رضا" ثابت ہوئے کہ جہاں انہیں خوشنما آقاؤں نے لڑانا چاہا، یہ لڑے اور جوان سے کہلوانا چاہا، کہتے گئے۔ تازہ خداؤں کو خوش کرنے کے لیے کہیں انہوں نے "جہاد" کا مفہوم بدلا، تو کہیں دلّی سے پشاور تک شدھ رحال کیا اور کروایا۔ یہ اسی "وفاداری بشرطِ استواری"

کا نتیجہ تھا کہ آخر انہی کی راہ میں جان عزیز کی بازی تک لگا دی۔

ان کے برعکس وہ علمائے حق بھی تھے جنہوں نے اسلام سے منہ موڑا، نہ دشمنانِ ملت کے آلۂ کار بنے۔ مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا فیض احمد بدایونی، حضرت کافی مراد آبادی اور مولانا امام بخش صہبائی جیسے لوگ اپنی متاعِ حیات کو عظمتِ دین کے لیے وقف کیے ہوئے تھے اور انہوں نے آخر تک علمِ حق بلند کیے رکھا۔ شیرِ اسلام مولانا فضلِ حق خیر آبادی علیہ الرحمہ اسی کاروانِ حق کے سالار تھے جنہوں نے انگریز کے خلاف بڑی بلند آہنگی سے فتویٰ جہاد دیا تھا۔

دونوں گروہوں کے کردار میں زمین و آسمان کا فرق تھا، مگر بُرا ہو اندھی شخصیت پرستی کا جو دن کے اُجالوں کو رات کے اندھیارے اور رات کے اندھیاروں کو دن کے اُجالے قرار دینے سے نہیں چوکتی۔ مورخین کے ایک خاص تربیت یافتہ ٹولے نے اپنی خاص مصلحتوں کے پیشِ نظر انگریز پرست اسمٰعیل دہلوی کو شہیدِ اعظم ٹھہرایا اور فضلِ حق خیر آبادی سے بالکل روگردانی اختیار کی۔

زیرِ نظر تالیف اسی چوری کو، جو دراصل سینہ زوری کے مترادف ہے، واشگاف کرنے کے لیے معرضِ تحریر میں آئی ہے۔ محقق فاضل راجا غلام محمد صاحب نے ناقابلِ تردید تاریخی دلائل سے مجرموں کی نشان دہی کر کے اہلِ حق کی عظمتِ کردار سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے واقعتی "شہیدِ فی سبیل الافرنج" کی قلعی کھول کے رکھ دی ہے۔ دشمنانِ ملت کے ذکرِ منحوس سے جس خشکی کا خدشہ ہے، اسے ان کے برجستہ اشعار اور خوبصورت تراکیب نے دور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انداز بیان نہایت شگفتہ اور دل آویز ہو گیا ہے۔

اگر ظن و تخمین کے ظلمت کدے میں آوازۂ حق بلند کرنا فی الواقع کوئی عظیم کارنامہ ہے تو بلاشبہ راجا صاحب نے یہ حسین کارنامہ سر انجام دیا ہے۔

سید یعقوب علی شاہ

سابق پرنسپل گورنمنٹ پبلک سکول، مردان (سرحد)

راقم الحروف نے "امتیازِ حق" کا مطالعہ کیا اور تصویر کے دونوں رُخ دیکھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کا مجاہدانہ کردار اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کا انگریز کی حمایت و سرپرستی میں "جہاد"۔ ہر دو امر ایسے تھے جنہیں تاریخی دلائل و شواہد سے عوام و خواص کے سامنے لانا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ جناب راجا غلام محمد صاحب صدر ادارۂ ابطال باطل لاہور کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے پوری دیانت داری سے حقائق کا چہرہ بے نقاب کر دیا ہے۔

سید شمیم گوہر

ایڈیٹر "اشرفیہ" مبارکپور (بھارت)

"امتیازِ حق" پاکستانی عالم اور قلم کار جناب راجا غلام محمد صاحب کا ایک معلوماتی جامع اور مدلل قلمی شاہکار ہے۔ علامہ شاہ فضل حق خیرآبادی اور سید احمد رائے بریلوی و اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ جس عرق ریزی اور محنت و کاوش کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لائق تحسین و آفرین اور قابلِ فخر ہے۔ تاریخی حقائق و شواہد اور بے شمار حوالہ جات کی موجودگی میں "امتیازِ حق" کے قارئین کرام سید احمد رائے بریلوی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی کی فرنگی نواز طبیعت کی پراگندگی پر یقیناً چیخ اٹھیں گے اس سلسلے میں مورخین اپنے ہوں یا غیر، ان حقائق کی اعترافی تحریر "امتیازِ حق" میں ہر جگہ ملے گی۔ انہی حوالہ جات کی بنیاد پر راجا صاحب کی پُرخلوص کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔

علامہ کے سلسلے میں راجا صاحب کی اس کامیاب کوشش کے بعد ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ "امتیاز حق" کا پہلا ایڈیشن پاکستان میں شائع ہونے کے بعد دوسرا ایڈیشن المجمع الاسلامی مبارک پور، اعظم گڑھ یوپی نے بھی شائع کرکے اپنے اشاعتی مشن کی روشنی میں ایک عظیم کارنامہ انجام دیا۔ (ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، بھارت۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۰ء)

پروفیسر آفتاب احمد نقوی

گورنمنٹ ظفر علی خاں کالج، وزیر آباد

ہماری قومی زندگی میں یہ ایک بہت بڑا المیہ رہا ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر مورخین نے تاریخ نویسی جیسا اہم ترین فریضہ سر انجام دیتے وقت موجود ٹھوس تاریخی حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے عقائد و نظریات کو بنیاد بنا کر فیصلے کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ تاریخ منصفانہ انداز کی بجائے یک طرفہ کارروائی کے طور پر ہمارے سامنے آئی اور وہ لوگ جن سے مورخ کو ذاتی عقائد کی بنا پر اختلاف تھا، ان کے کارہائے نمایاں کو یا تو ظاہر کرنے سے دانستہ گریز کیا گیا یا پھر ان کے سیرت و کردار کو مسخ کرکے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ یہی صورت حال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے بعد کے واقعات سے متعلقہ شخصیات، جن میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا نام سر فہرست ہے، کے متعلق پیش آئی۔ زیر نظر کتاب "امتیاز حق" میں آپ ہی کی سیرت و کردار اور مذہبی و سیاسی کارہائے نمایاں کا تقابلی جائزہ شاہ اسمٰعیل دہلوی کے سیرت و کردار کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ کتاب کے مولف راجا غلام محمد صاحب کے نقطۂ نظر سے اگرچہ اختلاف ممکن ہے لیکن ان کی اس کاوش کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے جو انہوں نے تقریباً ایک صد کتب و رسائل کے مطالعے کے بعد تحریر کی ہے اور خوبی یہ ہے کہ تمام تر حوالہ جاتی

کتب انہی لوگوں کی تحریریں ہیں جو اسمٰعیل دہلوی کے عقائد سے متفق تھے۔ تحریکِ پاکستان اور برصغیر کی سیاسی و مذہبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ عام قاری کے ذوقِ مطالعہ کے پیشِ نظر کتاب میں جابجا خوبصورت اور برمحل اشعار کے استعمال سے کتاب کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

(ماہنامہ "کتاب" لاہور۔ جنوری ۱۹۸۰ء)

سید الطاف علی بریلوی

مدیرِ اعلیٰ سہ ماہی "العلم" کراچی

سیکرٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی

آپ نے ایک نہایت اختلافی مسئلہ پر بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور کتاب میں ایسا مواد جمع کیا ہے جو عام طور پر لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے۔

افتخار احمد القادری

المجمع الاسلامی، مبارک پور (بھارت)

"امتیازِ حق" ایک تہلکہ خیز اور انقلاب انگیز کتاب ہے۔ قصرِ باطل کے لیے زلزلہ اور محلِ اسمٰعیلیت کے لیے طوفان ہے۔ وقت کی یہ ایک اہم ضرورت تھی، جس کا احساس ایک زبردست "زاجا" نے کیا اور ایک عظیم تقاضا تھا جسے پورا کیا گیا۔ اس کتاب میں جس سلیقے سے مواد فراہم کیا گیا ہے وہ بس اسی کا حصہ ہے۔ اسے وہ بھی پڑھے گا جو رد کے موضوع پر کسی کتاب کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتا، جو مطالعہ کرے گا جو مناظرانہ انداز سے گھبراتا ہے، اسے اہلِ حق بھی پڑھیں گے اور اہلِ

باطل بھی۔ اسے مذہب سے دلچسپی اور گہری وابستگی رکھنے والے بھی پڑھیں گے اور وہ بھی پڑھیں گے جو فکر و شعور کے حامل ہیں اور اس سے وہ بھی استفادہ کریں گے جو اپنے آپ کو غیر جانبدار بتاتے ہیں — اور سب کو اس سے کچھ نہ کچھ روشنی ملے گی۔ یہ کتاب مینارۂ رشد و ہدایت بھی ہے اور اپنے زعم میں جو خود کو تاریخ کا بیڑہ اٹھانے والے سمجھتے ہیں، ان کے لیے تازیانۂ عبرت بھی۔ یہ کتاب ان کی تاریخ گری کے لیے ایسا کھلا چیلنج ہے جس کا جواب نہیں۔ آپ کو اس عظیم اجتہادی کاوش پر المجمع الاسلامی کے تمام کارکنوں کی طرف سے مبارک باد۔ ربّ قدیر آپ کو اس کا بھرپور صلہ رحمت فرمائے اور اس کو سامانِ نجات بنائے۔ آمین!

پروفیسر وقار حسین طاہر

گورنمنٹ سرسید کالج، گجرات

امتیازِ حق و باطل کے سلسلے میں راجا غلام محمد صاحبؒ کی تصنیف "امتیازِ حق" جو مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بصیرت افروز تحقیقی مقالہ ہے جس کی ترتیب و تدوین مستند تاریخی حوالوں سے انتہائی مدلل انداز میں کی گئی ہے۔

یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی ایسے صاحبِ علم کے اصل کردار کے متعلق مسلمانانِ ہند و پاک بہت کم یا پھر کچھ بھی نہیں جانتے اور اس سے بھی بڑا المیہ تو یہ ہے کہ دریائے شور کے پار کسمپرسی کے عالم میں وفات پا جانے والے جید اور نڈر عالمِ دین علامہ فضلِ حق خیرآبادی جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، ان کی عظمت کے متعلق بھی لوگ لاعلم ہیں۔ افسوس کہ ایسے کئی واقعات جن کے پس پردہ برطانوی سامراج کام کر رہا تھا، ابھی تک لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔

تاریخ کو جان بوجھ کر مسخ کیا گیا اور فرزندانِ توحید جنہوں نے فی الواقع نظامتِ انگلشیہ کا مقابلہ کیا، عوام کی نظروں سے اوجھل رہے اور وہ لوگ جنہوں نے سرکارِ انگلشیہ سے مصالحاتی رویّہ اور سودے بازی کا سلسلہ جاری رکھا، انہیں ہر طرح سے دنیاوی سرفرازی ملی۔ الجھاؤ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب نام نہاد دانشور اور ذی شعور لوگ اپنے تعصبات کی روشنی میں ایسے لوگوں کی عظمتوں کے گن گاتے ہیں اور اس طرح لوگوں میں ابہام کی ترویج کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو تعصبات، فرسودگی اور اضافی مسائل سے آلودہ کرتے ہیں۔

جناب محمد طفیل

ایڈیٹر ماہنامہ "فکر و نظر" اسلام آباد

زیرِ تبصرہ کتاب برِّ عظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کے اس دور سے بحث کرتی ہے۔ جب مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی اور انگریز دنیا کے اس عظیم خطّہ میں اپنا تسلط جما رہے تھے۔ افراتفری اور طوائف الملوکی کا دور ایسا ہوتا ہے کہ جمعیت بکھر چکی ہوتی ہے اور منتشر گروہ اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہوتے ہیں اور جو قومیں اقتدار کی گھات میں ہوتی ہیں؛ وہ منتشر گروہوں کو باہم لڑا کر خود مسندِ اقتدار پر براجمان ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی رویّہ انگریزوں نے اختیار کیا اور برِّ عظیم میں بسنے والی مختلف اقوام کو آپس میں لڑایا جس سے ایک جانب تو ان کی توجہ انگریزوں کی یلغار سے ہٹ گئی اور دوسری طرف باہم لڑ کر وہ کمزور ہو گئے؛ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

تاہم مصنّف کے اپنے خیال کے مطابق اس کتاب کا مرکزی موضوع یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا اسمٰعیل دہلوی و مولانا سیّد احمد بریلوی کی دینی، ملّی، سیاسی اور تحریکِ پاکستان کے تعلق سے خدمات کا موازنہ کیا جائے اور مصنّف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مولانا فضلِ حق خیر آبادی دین و ملّت اور امّتِ مُسلمہ کے سچے شیدائی تھے، جبکہ مولانا اسماعیل دہلوی اور مولانا سیّد احمد بریلوی

اگرچہ جہاد کرتے رہے، لیکن وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انگریزوں سے مراعات یافتہ تھے جس کے ثبوت میں انہوں نے جابجا مدلل حوالے پیش کیے ہیں۔

اس کتاب کی تصنیف سے جناب راجا غلام محمد صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دورِ حاضر کے بعض تاریخ نگار جیسے مولانا غلام رسول مہر اور جناب محمد ایوب قادری صاحب نے حقائق سے صرفِ نظر کر کے مولانا فضلِ حق کی حیثیت گھٹانے اور دوسرے دونوں علماء کی طرفداری کر کے انہیں بلند مقام دلوانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ کتاب کا پہلا حصہ اس امر سے بحث کرتا ہے کہ جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے کیا کردار ادا کیا۔ فاضل مصنف نے علامہ خیرآبادی کے فتویٰ جہاد، دیگر مساعی، بہادر شاہ ظفر سے مشاورت اور عدالت میں ان کی حق گوئی، سزائے قید بعبور دریائے شور اور وہیں قید و بند میں ان کی وفات کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ خیرآبادی ملتِ اسلامیہ کے بہی خواہ، اسلام کے نڈر سپاہی اور حق گو مجاہد تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ خیرآبادی کی خدمات لائقِ تحسین رہیں۔

کتاب کا دوسرا بڑا حصہ اس موضوع سے بحث کرتا ہے کہ مولانا شاہ اسمٰعیل اور ان کے رفیقِ کار مولانا سید احمد بریلوی کا کردار مشکوک سمجھا جاتا رہا اور صوبہ سرحد میں حملے کے وقت ان کے عقائد، ان کے کردار اور تحریکِ جہاد کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ انہیں انگریز کے جاسوس اور اسلام سے منحرف سمجھا گیا اور اس کے ثبوت میں انہوں نے معاصر کتب سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔

ہماری رائے میں جس موضوع پر فاضل کتاب نگار نے قلم اٹھایا ہے، وہ بہت اہم ہے اور اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے کردار اور اعمال کا بے لاگ جائزہ لیں۔ اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر جب زیرِ تبصرہ کتاب پڑھتے ہیں، تو اس سے ایک پہلو تو عیاں ہوتا ہے لیکن دوسرے نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں ہوتی۔ تاہم برِ عظیم میں مسلمانوں کی تاریخ کے ایک اہم دور سے یہ کتاب بحث کرتی ہے اور محققین کو مواد مہیا کرتی ہے کہ وہ اس موضوع پر اس پہلو سے بھی غور کریں تاکہ حقائق تک پہنچنے میں مدد مل سکے۔

علمی موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت ایسی زبان استعمال کی جائے جس سے یہ عیاں نہ ہو کہ کسی پر حملہ کیا جا رہا ہے یا کسی کی پگڑی اچھالی جا رہی ہے، تو بحث زیادہ موثر اور مفید ہوتی ہے، جبکہ "امتیازِ حق" میں اس امر کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے تاہم ۱۸۵۷ء اور اس سے قریبی دور کے سیاسی و فکری حالات پر مشتمل یہ کتاب مطالعہ پاکستان کے لیے مفید ہوگی۔ علامہ خیر آبادی کی خدمات کا اعتراف بھی ہو سکے گا۔

مصنف نے جا بجا اشعار بھی اس کتاب میں نقل کیے ہیں۔ بلاشبہ اشعار کی اپنی افادیت اور حیثیت ہے، لیکن سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت اشعار کا سہارا لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا جبکہ بعض اوقات ایسا کرنے سے موضوع سے انصاف نہیں ہوتا، اس لیے سنجیدہ تحریروں میں اشعار کی بجائے قوی اور مضبوط دلائل پیش کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

(ماہنامہ "فکر و نظر" اسلام آباد - جنوری ۱۹۸۰ء)

جناب حاجی احمد مجاہد

ہفت روزہ "افق" کراچی

محترم راجا غلام محمد پوری پاکستانی قوم کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس نامِ نہاد گروہ کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے، بلکہ "امتیازِ حق" (جو کہ اسم بامسمٰی کتاب ہے) کے ذریعے بطلِ حریت شہید اندیمان علامہ فضلِ حق خیر آبادی اور اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا جس محققانہ انداز میں تقابلی جائزہ پیش کیا ہے اس سے حقائق پر ڈالے جانے والے پردے اٹھ چکے ہیں اور تحریکِ آزادی کے حالات و واقعات اور پس منظر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ یہ کتاب ایسی تصویر ہے جس سے تمام چہرے بخوبی پہچانے جا سکتے ہیں کہ کون کس کیمپ میں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ ۸۵ نادر اور تاریخی کتب کے سینکڑوں حوالوں سے راجا غلام محمد نے ایسی کتاب

مولانا محمد عبدالمنعم ہزاروی مرحوم

اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، حق اور باطل کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے اور ایک ایسی سازش کا پردہ چاک کیا گیا ہے جس کا تانا بانا گزشتہ ایک صدی پر محیط ہے۔ مصنف نے مجاہدِ تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء علامہ فضلِ حق خیرآبادی اور ننگِ اسلاف مولوی اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تقابل کیا ہے اور ناقابلِ تردید حقائق و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ علامہ خیرآبادی نے ملّت و مذہب کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور اسمٰعیل دہلوی نے ملت کش کا رول ادا کیا۔ آدمی جس کتاب کو ایک نشست میں ختم کرلے اور پھر بار بار پڑھنے کو جی چاہے، یقیناً وہ کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں عظیم ہوتے ہیں اور اس بوڑھے آسمان تلے ایسی کتابیں بھی موجود ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جو لگ بھگ ۸۰ کتب کا نچوڑ ہے۔ زبان و بیان انتہائی شُستہ اور شگفتہ۔

(ماہنامہ "ترجمانِ اہلِ سُنّت" کراچی — مئی، جون ۱۹۷۹ء)

پروفیسر شاہین ملک

چکر اله ہاؤس، ۵۹-سی — اعوان کالونی۔ ملتان روڈ، لاہور

(پنجابی میں)

"امتیازِ حق" کتاب وچ جھوٹ سچ دا نتارا تاریخی حوالیاں نال کیتا گیا اے۔ شاہ اسمٰعیل تے مجاہداں دی تحریکِ دا بھانڈا پھوڑ دیاں ایہہ ثابت کیتا گیا اے کہ ایہہ جہاد بدیسی حاکم انگریز دے وِرُدھ اکا نہیں سی، سگوں انگریزاں دی راہ وچ وڈی دیسی طاقت پنجاب دے سکھاں دے خلاف

مرتب کی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو مستند بھی ہے اور زبان وادب کا لازوال خزینہ بھی۔

موضوع کی مناسبت سے جگہ جگہ جو اشعار دیئے گئے ہیں، انہوں نے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشعار خاص طور پر اسی لیے لکھے گئے تھے۔ راجا صاحب کو زبان وادب پر مکمل عبور حاصل ہے۔ انہوں نے حوالوں کے قطرے جس محنت اور عرق ریزی سے جمع کیے ہیں، وہ اس کتاب کی صورت میں ایسا سیلِ رواں بن گیا ہے جس نے نام نہاد مؤرخین کی ۴۰ سالہ کاوشوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ایک ہی نشست میں پوری کتاب ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ کتاب احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا بہترین نمونہ ہے۔ مخالفین اس کتاب کی اشاعت پر بہت چراغ پا ہوئے، مگر اس کا جواب لکھنا ان کے بس کا روگ نہیں، کیونکہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ خود ان کی تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کو پڑھنی چاہیے۔ خاص طور پر طلباء کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہر لائبریری میں اس کتاب کا موجود ہونا ضروری ہے۔ (ہفت روزہ "اُفق" کراچی - ۲۷ اگست تا ۹ ستمبر ۱۹۷۹ء)

صاحبزادہ محمد محب اللہ نوری

بصیر پور (اوکاڑہ)

یہ بات کتنی روح فرسا ہے کہ آج کا درسی نصاب ابن الوقتوں کو جنگِ آزادی کا ہیرو بنا کر پیش کر رہا ہے۔ نئی نسل بھٹک رہی ہے، اُسے بھٹکایا جا رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اسی جنگِ آزادی کے دو مشہور اور متضاد کرداروں (مولوی اسمٰعیل دہلوی اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی) پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ فاضل مؤلف نے دودھ کا دودھ اور پانی کا

پانی کردکھایا ہے۔ مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ایک کردار پھول ہے تو دوسرا کانٹا۔ ایک کعبہ میں جبین نیاز خم کرتا ہے، تو دوسرا انگریزی صنم خانے کی دہلیز پر سجدہ ریز ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مصنف بالکل غیر جانبدار رہے ہیں۔ ان کا قلم حقائق کی روشنی میں اپنی راہ خود متعین کرتا گیا ہے۔ عقیدت کی تند و تیز موجوں میں نہ بہا ہے، نہ ادھر جھکا ہے نہ ادھر لڑھکا ہے

اس دور میں درسی نصاب تیار کرنے والے مصنفین و مؤرخین کو انہی حقائق کے پیش نظر اب کام کرنا ہوگا۔ مؤرخین سے ہٹ کر ایک عام پاکستانی کو بھی حقائق سے خبردار رہنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بار بار مطالعہ ضروری ہے۔

(مجلہ نور الحبیب بصیرپور۔ ضلع اوکاڑہ)

جناب اختر شاہجہانپوری مظہری

معرفت اجمل بک ڈپو۔ آر۔ اے بازار لاہور چھاؤنی

آپ نے ایسا موضوع اختیار کیا جو آج کل شجر ممنوع بنا ہوا ہے اور کسی بھی اختلافی عنوان پر لکھنے یا بولنے والے کو نظر استحسان سے نہیں دیکھا جاتا کیونکہ قلم زیادہ تر دشمن عناصر کے ہاتھوں میں رہا ہے اور انہوں نے صداقت و انصاف اور دین و دیانت کا خون کرتے ہوئے رہزنوں کو تقدس مآب رہنما اور سیرل کور ہزن کو بادر کرنے کا اس حد تک التزام کیا کہ اپنی تمام صلاحیتیں اسی مقصد کے حصول کی خاطر داؤ پر لگا دیں۔

ایسے نامساعد حالات میں آپ انصاف کو تلاش کرنے کی خاطر نکل کھڑے ہوئے اور تاریخ کی زلف پریشاں کو سنوارنے کا مصمم ارادہ کر بیٹھے۔ اس موضوع پر اگر کوئی انصاف دشمن قلمکار خامہ فرسائی کرتا تو یقیناً وہ آپ کی طرح حقائق کو کبھی منظر عام پر نہ لاتا بلکہ حقیقتوں پر تہہ در تہہ پردے ڈال دیتا بہر حال اس خشک موضوع کو خوب نبھایا یا موضوع کی خشکی کو دلچسپ شعروں کی تری سے خوش گوار کیا۔ انصاف کی حلاوت سے اس کھاری پانی کو شیرۂ جاں بنا دیا۔ یہ ناچیز جب "امتیاز حق" پڑھنے لگا تو ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھ لی۔

سی۔ اس تحریک نوں انگریزاں نے ہر طرح دی امداد دی دتی سی۔ انج ایہ کتاب اپنی تاریخ نوں نویں سریوں گوہ بھن تے پرکھن دی دعوت دیندی اے، تاں جو حق سچ تے جھوٹ وکھ وکھ ہو جاوے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی بارے تاں ساریاں گلاں منن یوگ نیں پر مجاہداں بارے ہر قسم دے لکھتی ثبوت پیش کر کے اوہناں دی اصلیت نوں ننگا کرنا جرأت تے ہمت دا کم اے، جو اس کتاب نے کر وکھایا اے۔ البتہ بیان دا ڈھنگ بوہتا مناظرانہ تے فرقہ وارانہ اے۔

المجمع الاسلامی دا اسلامی اکیڈمی)

مبارک پور۔ اعظم گڑھ۔ یوپی (بھارت)

"امتیازِ حق" کا دوسرا ایڈیشن "المجمع الاسلامی" مبارکپور نے شائع کیا تھا۔ اس کے "اختتامیہ" کے طور پر ادارے کی طرف سے یہ تحریر شائع کی گئی تھی:

"امتیازِ حق" راجا غلام محمد لاہور کی ایک ایسی گران قدر تصنیف ہے جس میں علامہ فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا تاریخی جائزہ پہلی مرتبہ اس دیانت و انصاف کے ساتھ اہلِ علم کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ وہ حقائق و واقعات کی تہ تک پہنچ کر صحیح اور سچے نتائج اخذ کر سکیں۔ ایک مدت سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ حسن و قبح اور نیک و بد کے بجائے "اپنے اور بیگانے" کا امتیاز کر کے تاریخیں بنائی جا رہی ہیں اور عقل و دیانت کے خلاف روایتوں کا اختراع کر کے اپنے آپ کو مردِ میدان ثابت کرنے کی شب و روز کوششیں کی جا رہی ہیں، لیکن فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایسے نام نہاد مؤرخین کے رُخ سے نقاب اُلٹ کر انہیں از سرِ نو کچھ دیکھنے سننے پر مجبور کر دیا ہے اور ناقابلِ تردید تاریخی دلائل و شواہد کے ساتھ یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ علامہ فضلِ حق خیر آبادی تحریک آزادیٔ ہند کے اوّلین قائدوں اور

رہنماؤں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کے مالک ہیں اور ان کے برعکس شاہ اسمٰعیل دہلوی انگریزوں کے بہی خواہ اور ان کے ہمیشہ وفادار رہے ہیں، اس لیے سکھوں کے خلاف ان کے جنگ و جدال کو تحریک آزادی ہند کا جزاور کوئی حصّہ قرار دینا ایک تاریخی خیانت ہے۔

راجا غلام محمد صاحب کو ہم پُرخلوص خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک نہایت ضروری موضوع پر قلم اٹھا کر تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب ہزاروں طالبانِ حق کے لیے مینارۂ رشد و ہدایت ثابت ہو کر عوام و خواص ہر ایک کے لیے زیادہ سے زیادہ سود مند اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

العقد النامی علی الجامی

ہدیہ ۶۰/۰۰

للفاضل العلامہ محمد رحمی بن عبد اللہ الاکینی الرومی

(المتوفی ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹م)

مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور

سکول کے طلباء کے لیے

کتاب	ہدیہ
ہم اسلام (پانچ حصے)	۱۸/۰۰
نماز مترجم (مدینہ پبلشنگ)	۱/۷۵
نسیم رحمت	۴/۵۰
انگوٹھے چومنے کا مسئلہ	۱/۰۰
برکاتِ میلاد	۱/۵۰
ثواب العبادات	۱/۵۰
سچی حکایات (پانچ حصے)	۵۵/۵۰
نقش وفا	۴/۰۰
نورانی حکایات	۱۰/۵۰

کالج کے طلباء کے لیے

کتاب	ہدیہ
انوار الحدیث	۳۶/۰۰
احکامِ شریعت	۲۴/۰۰
نظامِ شریعت	۱۲/۵۰
فاضل بریلوی اور امور بدعت	۲۴/۰۰
فاضل بریلوی اور ترکِ موالات	۶/۰۰
تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم	۱۹/۰۰
خطبات آل انڈیا سنی کانفرنس	۲۲/۰۰
اکابر تحریک پاکستان	۴۵/۰۰
سیرت [illegible]	۳۹/۰۰

کتاب	ہدیہ
حیاتِ مولانا احمد رضا خاں	۳۰/۵۰
باغی ہندوستان	۲۰/۰۰
زلف و زنجیر (اول و دوم)	۳۶/۰۰

قرآن پاک کا ترجمہ از مولانا احمد رضا خاں بریلوی — مختلف ہدیوں میں دستیاب ہے

کاروباری حضرات کے لیے

کتاب	ہدیہ
کشف المحجوب	۴۵/۰۰
مکاشفۃ القلوب	۴۹/۰۰
قانون شریعت	۴۵/۰۰
مدارج النبوۃ	۱۲۵/۰۰
عجائب القرآن	۹/۰۰
جاء الحق	۴۸/۰۰
مقام ولایت و نبوت	۲۱/۰۰
جذب القلوب	۲۴/۰۰
دین مصطفےٰ	۲۷/۰۰

بچیوں اور خواتین کے لیے

کتاب	ہدیہ
سنی بہشتی زیور	۳۰/۰۰
جنتی زیور	۳۶/۰۰
[illegible] (مرشد کے بعد کیا کرتے ہیں؟)	۲۰/۰۰
عورتوں کی حکایات	۳۰/۰۰

چند اہم درسی تاریخی اور علمی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
العقد الدری حاشیہ شرح جامی	۶/۰۰	حاشیہ بیضاوی علامہ سیالکوٹی	۷/۰۰	تاسیس التقدیس [illegible]	[illegible]
فوائد حکیمیہ حاشیہ لمعات شمسیہ	۹/۰۰	اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ	[illegible]	فیض [illegible]	[illegible]
تیسیر القرآن	۲/۵۰	عینی علی الکنز مجلد	۱۲۰/۰۰	تحقیق الفتویٰ	۳۰/۰۰
پند نامہ	۳/۰۰	جامع الغموض (فارسی)	۸۰/۰۰	باغی ہندوستان	۲۶/۰۰
کریمہ حاشیہ محمد عبد الحکیم شرف قادری	۱/۰۰	مسوّی مصفّی شرح موطا امام مالک	۱۸۰/۰۰	المبین	۲۱/۰۰
نام حق	۱/۵۰	تسہیل المبانی شرح مختصر المعانی	۶۰/۰۰	سنی کانفرنس ملتان و مراد	۴/۵۰
مرقاۃ منطق	۴/۵۰	شرح جامی	۶۶/۰۰	سنی کانفرنس	۱/۵۰
تحفہ نصائح	۱۳/۵۰	کنز الدقائق	۷۲/۰۰	فتاویٰ قادریہ	۹/۰۰
بدائع منظوم	۶/۰۰	ہدایہ اولین	۷۵/۰۰	فتاویٰ رضویہ (اول تا پنجم)	۳۹۰/۰۰
قانونی قاعدہ	۱/۸۰	ہدایہ اخیرین	۷۵/۰۰	فتاویٰ نوریہ (اول دوم)	۸۶/۰۰
شرح مرقاۃ	۵/۰۰	یاد اعلیٰ حضرت	۴/۰۰	کشف النور عن اصحاب القبور (عربی اردو)	۲/۰۰
حاشیہ قاضی مبارک	۳۰/۰۰	التوسل (اردو عربی)	۵/۰۰	تاریخ تناولیاں	۷/۰۰
قانونچہ کھیوالی	۵/۰۰	استاذ العلماء	۳/۰۰	محمد نور	۳/۰۰
صرف بہترال (فارسی)	۶/۰۰	نغمہ توحید	۱۶/۰۰	گلزار رحمانی	۱/۵۰
منیۃ المصلی (عربی نصابی)	۱۵/۰۰	حضرت قاضی سلطان محمود (دیوان شریف)	۱/۵۰	سیرت رسول اکرم	۲/۵۰
التعلیق المجلی حاشیہ منیۃ المصلی مجلد	۶۰/۰۰	تعارف علمائے اہل سنت	۲۴/۰۰	افکار حق	۲/۵۰
نبراس شرح شرح عقائد مجلد	۳۶/۰۰	تذکرہ اکابر اہل سنت	۴۵/۰۰	امتیاز حق	۱۲/۰۰
میر زاہد ملا جلال	۱۵/۰۰	مرآۃ التصانیف	۴۵/۰۰	اغثنی یا رسول اللہ	۴/۵۰
الکافی شرح ایساغوجی	۱/۵۰	سنی بہشتی زیور	۳۰/۰۰	الحجۃ الفائحہ (امام احمد رضا)	۲/۰۰
فیض الادب (اول دوم)	۵/۰۰	دو نور مجدد	۲/۵۰	انگوٹھے چومیے	۱۵/۰۰
البشیر الکامل حاشیہ شرح مأۃ عامل	۴/۰۰	بہار اسلام (اول تا پنجم)	۱۸/۰۰	غایۃ التحقیق	۲/۰۰
بشیر الشافیہ شرح کافیہ	۴/۰۰	بہار اسلام (اول تا پنجم)	۳۶/۰۰	دوام العیش	۶/۰۰
[illegible]	۲۱/۰۰	مولانا عبد القدیر بدایونی	۱/۵۰	بذل الجوائز	۴/۰۰
[illegible] علی جلالین	۲۰۰/۰۰	الروض المجود (عربی اردو)	۴/۵۰	احکام شریعت	۲۴/۰۰
سبع سنابل (فارسی)	۲۴/۰۰	اسلامی نصاب	۱۵/۰۰	اجلی الاعلام [illegible]	[illegible]
بشارات خیرات	۳۰/۰۰	حسام الحرمین (امام احمد رضا)	۱۲/۰۰	حدائق بخشش	[illegible]

مکتبہ قادریہ جامعہ نظامیہ رضویہ - اندرون لوہاری دروازہ لاہور پاکستان